داعیٔ رجوع الی القرآن، بانیٔ تنظیم اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

کے دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

کی شہرۂ آفاق پزیرائی اور مقبولیت کے بعد اب پیش ہے:

مختصر

بیانُ القرآن

ترجمہ مع منتخب حواشی

❁ امپورٹڈ میٹ پیپر ❁ مضبوط مراکو جلد ❁ 1248 صفحات

~~-/4500~~ روپے کے بجائے

صرف -/2200 روپے میں

فری ہوم ڈیلیوری کے ساتھ

رمضان پیکج کے تسلسل میں

مکتبہ خُدّام القرآن لاھور

36-K، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

maktaba@tanzeem.org 0301-1115348

صفر المظفر ۱۴۴۶ھ

اگست ۲۰۲۴ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات

تنظیمِ اسلامی

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

اسلام میں پردے کے احکام

اور

یو این او کا سوشل انجینئرنگ پروگرام

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ

وَاذۡکُرُوۡا نِعۡمَۃَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ وَمِیۡثَاقَہُ الَّذِیۡ وَاثَقَکُمۡ بِہٖۤ ۙ اِذۡ قُلۡتُمۡ سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا ۫ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

جلد : 73

شمارہ : 8

صفر المظفّر 1446ھ

اگست 2024ء

فی شمارہ : 50 روپے

سالانہ زرِ تعاون: 500 روپے

مُدیر
حافظ عاکف سعید

مجلس ادارت:
ایوب بیگ مرزا، خورشید انجم

نائب مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

ادارتی معاون:
حافظ محمد زاہد، محمد خلیق

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700 ، فون: 3-35869501

ای میل: maktaba@tanzeem.org ، 0301-111-5348

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

رابطہ برائے ادارتی امور: (042)38939321

publications@tanzeem.org

ویب سائٹ: **www.tanzeem.org**

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: ”دارُالاسلام“ ملتان روڈ چوہنگ لاہور

(پوسٹل کوڈ 53800) فون: (042)35473375-78

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال ــــــــــــ 5

یومِ آزادی ـــ یومِ احتساب

خورشید انجم

تذکرہ و تبصرہ ــــــــــــ 9

اسلام میں پردے کے احکام

اور یو این او کا سوشل انجینئرنگ پروگرام

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

بیانُ القُرآن ــــــــــــ 39

سُورَۃُ الشَّمۡس + سُورَۃُ اللَّیۡل

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

منبر و محراب ــــــــــــ 56

اخلاصِ نیّت کی اہمیت

قرآن و احادیث کی روشنی میں

خورشید انجم

دعوتِ فکر ــــــــــــ 65

قیامِ پاکستان کی بنیاد اور ہماری ذِمّہ داریاں

ممتاز ہاشمی

توضیح و تنقیح ــــــــــــ 69

مدیر ”مفاہیم“ کی چند فکری غلط فہمیاں

مولانا خان بہادر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ○

یومِ آزادی — یومِ احتساب

اگست کا مہینہ اس لحاظ سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں ہمیں آزادی جیسی دولت نصیب ہوئی۔ یہ محض ایک قوم کی آزادی نہیں تھی بلکہ ایک نظریہ یعنی نظریہ اسلام کی بنیاد پر ایک مملکت کا قیام عمل میں آیا۔ یوں ریاستِ مدینہ کے بعد پاکستان دوسری ریاست ہے جو اسلام کے نام پر وجود میں آئی۔ اگرچہ اسرائیل کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بھی مذہب کے نام پر وجود میں آیا لیکن حقیقتاً یہودیت ایک نسلی مذہب ہے اس لیے اسرائیل ایک نسلی ریاست ہے۔ دوسرے یہ کہ پاکستان ایک جمہوری عمل کے نتیجے میں اور تاریخی‘ جغرافیائی‘ نسلی‘ لسانی عصبیت کی نفی کرتے ہوئے نظریہ اسلام کی بنیاد پر وجود میں آیا جب کہ اسرائیل مغربی استعمار کی دھونس‘ دھاندلی اور سازش کے نتیجے میں قدیم فلسطینی باشندوں کو بے دخل کر کے وجود میں آیا۔ اس مہینے کی مناسبت سے اور خاص طور پر ۱۴ اگست کو قوم کے رہنماؤں کی جانب سے سائیکلوسٹائل قسم کے بے روح اور پھس پھسے بیانات جاری کیے جاتے ہیں جن کا حقائق سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ صرف روایتی خانہ پری کے طور پر جاری کیے جاتے ہیں اور حقائق اس کے برعکس ہوتے ہیں۔ یہ مہینہ اور خاص کر ۱۴ اگست کا دن ہمارے لیے خود احتسابی کا دن ہے کہ ہم جائزہ لیں کہ پاکستان ہم نے کس مقصد کے لیے حاصل کیا تھا اور اس مقصد کو کس حد تک پورا کیا گیا!

اس آئینے میں اگر ہم اپنی صورت دیکھیں تو ہمیں انتہائی مایوسی ہوتی ہے کہ درحقیقت ہم نے سمتِ معکوس میں سفر کیا ہے۔ پاکستان کا قیام دو قومی نظریہ کی بنیاد پر عمل میں آیا۔ یہ نظریہ اسی وقت وجود میں آ گیا تھا جب محمد بن قاسمؒ نے اس سرزمین پر قدم رکھا۔ اسی بات کو قائداعظم محمد علی جناح نے بڑے سادہ مگر محکم انداز میں علی گڑھ کے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے یوں فرمایا کہ: ’’پاکستان کی بنیاد اسی دن پڑ گئی تھی جس دن برعظیم کی سرزمین پر پہلا ہندو مسلمان ہوا تھا۔‘‘ قائداعظم کی اس بات کو مغل حکمران نورالدین جہانگیر اور مجدّد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمہ اللہ

کے درمیان کشمکش کے تناظر میں دیکھیے کہ مسلمان اُس دور میں اگرچہ سیاسی اور معاشی دونوں اعتبارات سے غالب تھے لیکن مجدد الف ثانیؒ کے نزدیک اصل چیز مسلمانوں کا جداگانہ تشخص تھا جسے جلال الدین اکبر کی پالیسیوں کی وجہ سے زک پہنچ رہی تھی۔

آیئے! تاریخ کے دریچوں سے دیکھتے ہیں کہ ہم نے یہ ملک کیوں حاصل کیا تھا۔ پون صدی قبل ہم نے بڑی دعاؤں‘ تمناؤں‘ آرزوؤں اور وعدوں کے ساتھ یہ ملک حاصل کیا تھا کہ اے باری تعالیٰ! ہم ایک علیحدہ خطۂ ارضی اس لیے حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ تیرے دین کا بول بالا کریں‘ تیرے نبی محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی شریعت نافذ کریں۔ پاکستان کے قیام کا مقصد فقط زمین کا ٹکڑا حاصل کرنا نہیں تھا بلکہ اس کی بنیادوں میں احیائے اسلام کا وہ جذبہ تھا جسے علامہ اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے تحریک پاکستان میں شامل کیا۔ یہ اقبال ہی تھے جنہوں نے وطنی قومیت کی نفی انتہائی زوردار انداز میں کی۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

پھر ۱۹۳۰ء کے خطبہ الٰہ آباد میں کہا کہ ’’اسلام کے پیش نظر ایک ایسا عالمگیر نظامِ سیاست ہے جس کی اساس وحی اور تنزیل پر ہے۔‘‘ مزید کہا کہ ’’اسلام کا مذہبی نصب العین اس اجتماعی نظام سے نامیاتی تعلق رکھتا ہے جو وہ قائم کرتا ہے۔ ایک کے مسترد کرنے سے دوسرا لامحالہ مسترد ہو جائے گا۔‘‘ اس لیے کسی پالیسی کی قومی سطح پر اس طرح تشکیل کہ اس سے اسلام کے یکجہتی کے اصول اپنی جگہ نہ رہیں‘ کسی مسلمان کے لیے ناقابلِ قبول ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ برعظیم میں اسلام کی بقا اور فروغ کے لیے ان کی نگاہ میں ایک آزاد مملکت کا قیام ناگزیر ہے۔ لہٰذا ان کا مطالبہ تھا کہ ’’اس لیے میں ہندوستان اور اسلام کے بہترین مفاد میں ایک مسلم ریاست کے قیام کا مطالبہ کرتا ہوں۔‘‘

قائداعظم نے اسلامی ریاست کے اصول بیان کرتے ہوئے کہا: ’’اسلام اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی‘ نہ کسی شخص یا ادارے کی‘ بلکہ قرآن حکیم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی کی حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے‘ جس کے لیے بہرحال آپ کو علاقے اور سلطنت کی ضرورت ہے۔‘‘

اسلامیہ کالج پشاور میں طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ’’لیگ ہندوستان میں ایسی

آزاد ریاستوں کے قیام کی علم بردار ہے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے تاکہ مسلمان وہاں اسلامی قانون کے مطابق حکومت کرسکیں۔'' ان الزامات پر کہ پاکستان میں قانون سازی شریعت اور قرآنی احکام کے مطابق نہیں ہوگی' آپ نے تردید کرتے ہوئے فرمایا: ''یہ بات قطعی غلط ہے۔'' ۲۱ نومبر ۱۹۴۵ء کو مسلم لیگ کانفرنس میں فرمایا: ''مسلمان پاکستان کا مطالبہ کرتے ہیں جہاں وہ خود اپنے ضابطہ حیات' اپنے تہذیبی ارتقا' اپنی روایات اور اسلامی قانون کے مطابق حکومت کرسکیں۔'' مبشرِ پاکستان اور معمارِ پاکستان کی نگاہ میں یہ مقصد تھا ایک علیحدہ مملکت کے قیام کا جس کے لیے تاریخ انسانی کی سب سے بڑی ہجرت ہوئی۔ لاکھوں افراد نے جانوں کی قربانیاں دیں اور ہزاروں مسلمان عورتوں کی عزتیں و عصمتیں پامال ہوئیں۔

یہ وہ فلسفہ تھا جس نے ''پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ!'' کی شکل اختیار کی۔ چترال تا کراچی اور خیبر تا راس کماری مختلف رنگ' نسل اور زبان کے حامل لوگوں کو مسلم لیگ کے جھنڈے تلے منظم کر دیا۔ پاکستان بننے کے بعد بدقسمتی سے بحیثیت مجموعی پوری قوم بالخصوص حکمران طبقے نے اس نظریہ سے انحراف کیا جس کی بنیاد پر پاکستان حاصل کیا گیا تھا۔ اب کرپشن' جھوٹ' خیانت' فریب ہماری پہچان بن چکے ہیں۔ اب تو ڈنکے کی چوٹ پر سب کچھ کیا جا رہا ہے۔ گویا: ع ''کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا!'' ہماری آزادی ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف کے پاس گروی رکھی جا چکی ہے۔

اہلِ سیاست ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے نہایت مکروہ اور بھونڈے سیاسی ہتھکنڈوں کا استعمال کر رہے ہیں۔ ہر ادارہ شکست و ریخت کا شکار ہے۔ جن اداروں کو پاکستان کی وحدت کی علامت سمجھا جاتا تھا آج ان پر انگلیاں اٹھائی جا رہی ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں جو قوم ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار تھی اب تقسیم در تقسیم ہو کر مختلف قومیتوں میں بٹ چکی ہے۔ اب تو اس سے بھی آگے بڑھ کر ایک بے سمت ہجوم بن چکا ہے۔ ع ''آہ وہ تیر نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف!'' یوں لگتا ہے کہ اب ہمارے دن گنے جا چکے ہیں۔ گویا ؎

برباد گلستاں کرنے کو بس ایک ہی اُلو کافی تھا
ہر شاخ پہ اُلو بیٹھا ہے انجامِ گلستاں کیا ہوگا!

ایسے گھٹاٹوپ اندھیروں میں کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا' اگر کوئی سہارا ہے تو صرف اللہ

سبحانہ وتعالیٰ کی ذات ہے۔ ؎

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی' جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرمِ خانہ خراب کو ترے عفوِ بندہ نواز میں!

ملک وقوم کی سلامتی اور اصلاحِ احوال کا اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ اللہ کے دامن کو مضبوطی سے تھام لیا جائے اور خود کو اس کی رحمت اور اس کی نصرت کا مستحق ثابت کیا جائے۔ قرآن مجید نے دوٹوک انداز میں بیان کر دیا ہے: ﴿اِنۡ تَنۡصُرُوا اللّٰہَ یَنۡصُرۡکُمۡ وَ یُثَبِّتۡ اَقۡدَامَکُمۡ ﴿۷﴾﴾ (محمد) ''اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم جما دے گا۔''

اللہ کے دین کی مدد و نصرت' اُس کے دین کے غلبہ و اقامت کے لیے جِدّ و جُہد کرنے سے عبارت ہے۔ اس کے عطا کردہ سیاسی' معاشی' سماجی نظام کے قیام کی جِدّ و جُہد سے اللہ کی نصرت وحمایت حاصل ہوگی۔ جب تک ہم اسلام کے نظام عدل وقسط کو قائم نہیں کرتے ہماری حالت کے سدھرنے کا بظاہر احوال کوئی امکان نہیں۔ لہٰذا اگر ہم اب بھی تحریک پاکستان کے دوران کیے گئے وعدوں کی تکمیل کر دیں اور ملک میں اسلام کے نظامِ عدل وقسط کو قائم کر دیں تو مملکت خداداد پاکستان دورِ حاضر کی ایک مثالی اسلامی فلاحی ریاست بن جائے گی۔ ؎

چمن کے مالی اگر بنا لیں موافق اپنا شعار اب بھی
چمن میں آسکتی ہے پلٹ کر چمن سے روٹھی بہار اب بھی!

❁ ❁ ❁

ماہنامہ "میثاق" لاہور

داعیٔ قرآن ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے قرآنی فکر کا ترجمان' ایک علمی' دعوتی اور تربیتی رسالہ!

صرف آپ ہی کے زیرِ مطالعہ کیوں؟

وقت اور حالات کی اشد ضرورت ہے کہ اسے ایک مشن سمجھ کر واعظین و مربّیین' تعلیمی اداروں' لائبریریوں' مکتبہ جات اور ہر گھر و فرد اور خاص طور پر الاقرب فالاقرب کی بنیاد پر اپنے دوست' احباب اور اعزّہ واقرباء تک پہنچانے میں اپنا کردار ادا کریں۔

یہ آپ کے لیے صدقہ جاریہ ہوگا!

اسلام میں پردے کے احکام
اور
یو این او کا سوشل انجینئرنگ پروگرام

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

(۵ نومبر ۲۰۰۴ء کو ایوانِ اقبال لاہور میں خطابِ عام)

خطبۂ مسنونہ اور تلاوتِ آیات کے بعد:

میرے عنوان میں اگرچہ ترتیب یہ ہے: ''اسلام میں پردے کے احکام اور یو این او کا سوشل انجینئرنگ پروگرام'' لیکن بیان میں مؤخر الذکر شے پہلے لا رہا ہوں تا کہ پس منظر معلوم ہو جائے کہ اس موضوع پر ہم آج کن حالات میں گفتگو کر رہے ہیں۔

یو این او کا سوشل انجینئرنگ پروگرام

گزشتہ تقریباً تین صدیوں سے یورپ میں ایک تہذیب پروان چڑھ رہی ہے لیکن اس کے بعض حصے پہلے ہی گلوبلائز ہو چکے ہیں۔ ایک آخری حصہ وہ ہے جس کو عالمی سطح پر رائج و نافذ کرنے کے لیے بہت ہی منظم کوششیں (concerted efforts) ہو رہی ہیں۔

درحقیقت فکرِ انسانی کو توہمات کے چنگل اور استخراجی منطق (deductive logic) کی تنگ نائیوں میں سے باہر نکالنا اسلام اور قرآن کی تعلیمات کا نتیجہ ہے‘ البتہ اس کے نتیجے میں دو اسباب کے باعث یہ تہذیب ایک غلط رخ پر پڑ گئی۔ پہلا سبب یہ تھا کہ یورپ میں اصل حاکمیت پوپ کی تھی۔ تھیوکریسی اپنی بدترین شکل میں رائج تھی۔ اس نظام میں جہاں بعض چیزیں اچھی تھیں وہاں دو بدترین باتیں بھی تھیں۔ پہلی یہ کہ سائنس اور فلسفہ کا پڑھنا

حرام تھا۔ کسی کے گھر سے سائنس اور فلسفے کی کتابیں نکل آتیں تو اسے زندہ جلا دیا جاتا۔ دوسری بات یہ ہوئی کہ یورپ کو یہ سبق مسلمانوں نے پڑھایا۔ یہ اصل میں سپین کی یونیورسٹیوں کی وجہ سے ہوا۔ جیسے ہمارے نوجوان تعلیم حاصل کرنے کے لیے امریکہ اور انگلستان جاتے ہیں ایسے ہی جرمنی‘ فرانس اور اٹلی کے نوجوان ہسپانیہ میں غرناطہ‘ ٹولیڈو اور قرطبہ کی یونیورسٹیز میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے آتے تھے۔ یہاں یہودیوں کا ایک بڑا مؤثر عنصر موجود تھا جس کا ایک خاص سبب تھا۔ یہودیوں کو عیسائیوں کے ہاتھوں شدید تعذیب (persecution) کا سامنا تھا۔ عیسائی جسے خدا کا بیٹا کہتے ہیں‘ یہودی اسے (معاذ اللہ!) ولد الزنا (bastard) سمجھتے ہیں۔ انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو جادوگر‘ مرتد‘ واجب القتل قرار دے کر (اپنے بس پڑتے) سولی پر چڑھایا۔ اس قدر فرق ہے‘ اتنا تضاد ہے۔

یہود کی عیاریاں

اس کا پس منظر یہ ہے کہ ۳۰۰ء میں جب قسطنطین (Constantine) جو قیصرِ روم تھا‘ اس نے عیسائیت اختیار کی تو اس کے ساتھ پوری رومن ایمپائر بھی عیسائی ہو گئی۔ اب عیسائیوں نے یہودیوں پر مظالم ڈھانے شروع کیے کہ جس کو ہم خدا کا بیٹا کہتے ہیں تم ان کے بارے میں ایسی بات کرتے ہو۔ تم نے انہیں سولی پر چڑھایا۔ پورے یورپ میں یہود کی بدترین تعذیب کی گئی۔ ان کے ghettos علیحدہ ہوتے تھے۔ انہیں شہروں میں آباد ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ کسی ضرورت کے لیے شہر میں آنے کے لیے وقت مقرر تھا کہ فلاں سے فلاں وقت تک آ سکتے ہیں۔ اس حوالے سے ہسپانیہ کی عیسائی حکومت بہت سخت تھی۔ چنانچہ یہودیوں نے ایک بہت ہوشیار حکمتِ عملی اختیار کی کہ جب طارق بن زیاد ہسپانیہ پر حملہ آور ہوئے تو ان کی مدد کی گئی۔ انہیں راستے بتائے گئے۔ مسلمانوں کے لیے تو یہ ایک اَن جانی دنیا تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہسپانیہ میں جب مسلمانوں کی حکومت مستحکم ہوئی تو یہودیوں کو ایک بار پھر تاریخ میں وہ مقام حاصل ہو گیا جو انہیں کبھی حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں مصر میں حاصل ہوا تھا۔ مصر میں وہ ''پیرزادے'' بن گئے تھے‘

اس لیے کہ مصر کا بادشاہ حضرت یوسف علیہ السلام کا عقیدت مند ہوگیا تھا۔ یہی حال یہاں ہوا۔ چنانچہ اسی ضمن میں اسرائیل کے پہلے وزیر اعظم بن گوریان نے یہ بات لکھی ہے:

"The Golden era of our Diaspora was Muslim Spain."

کہ مسلم ہسپانیہ ہمارے دورِ انتشار کا عہدِ زریں ہے۔ ان کا یہ دورِ انتشار ۷۰ء میں شروع ہوا تھا جب ٹائٹس رومی نے یروشلم میں ایک دن میں ایک لاکھ ۳۳ ہزار یہودیوں کو قتل کیا تھا۔ انہوں نے جو ہیکل سلیمانی دوسری مرتبہ بنایا تھا جسے سیکنڈ ٹیمپل کہتے تھے' اسے منہدم کیا' ختم کیا اور یہودیوں کو فلسطین سے باہر نکال دیا کہ اب جہاں سینگ سمائیں چلے جاؤ' یہاں تمہارے رہنے کا کوئی امکان نہیں۔ چنانچہ کچھ یورپ اور کچھ افریقہ میں چلے گئے' کچھ ایشیا میں آ گئے۔ اس کو وہ اپنا دورِ انتشار (Diaspora) کہتے ہیں' جس کا عہدِ زریں مسلم سپین ہے۔ جب ہسپانیہ میں بنواُمیہ کی حکومت تھی تو وہاں کا وزیراعظم بھی یہودی تھا۔ ان کو اتنی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ جو نوجوان جرمنی' فرانس اور اٹلی سے آ رہے تھے اسلام ان کو حریت اور آزادی کا سبق پڑھا رہا تھا۔ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا غلام نہ ہو۔ کوئی قوم کسی دوسری قوم کی محکوم نہ ہو۔ انسانوں کو حق حاصل ہو حکمرانوں کو چیلنج کرنے کا' ان سے جواب طلبی کا۔ یہ سبق خلافت راشدہ نے دنیا کو پہلی دفعہ دیا تھا۔ یہودیوں نے اس میں مزید مرچ مسالا لگایا کہ یہ آزادی دراصل مادر پدر آزادی ہے۔ خدا سے آزادی' شریعت سے آزادی' اخلاقی اصولوں سے آزادی!

پھر اسلام نے مساوات کا سبق دیا تھا کہ تمام انسان پیدائشی طور پر برابر ہیں۔ کسی رنگ کے ہوں' کسی نسل کے ہوں' کسی علاقے میں رہتے ہوں' کسی ناک نقشے کے ہوں' مرد ہوں یا عورت ہوں' پیدائشی طور پر سب برابر ہیں۔ ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ البتہ یہ نوٹ کر لیجیے کہ اسلام میں مرد اور عورت کے درمیان ایک فرق ہے۔ جب ایک مرد اور عورت شادی کے بندھن میں بندھ جائیں اور ایک خاندان کی بنیاد ڈالیں تو خاندان کے ادارے کا سربراہ مرد ہوگا۔ یہ بات دو اور دو چار کی طرح واضح ہے کہ کسی ادارے کے دو سربراہ نہیں ہو سکتے۔ سربراہ ایک ہی ہوتا ہے' البتہ اس کے نیچے آپ نائبین اور

معاونین جتنے چاہیں رکھ لیں۔ کسی بھی فرم کا مینجنگ ڈائریکٹر ایک ہوگا' ڈائریکٹر چاہے دس رکھیں' بیس رکھیں یا پچاس۔ اگر دو برابر کے سربراہ ہوں گے تو فساد ہی فساد ہوگا۔ دفتر میں ایک افسر ہے اور ایک چپڑاسی' ان میں انتظامی طور پر فرق ہے لیکن انسان ہونے کے ناطے یہ دونوں برابر ہیں۔ سیاسی اعتبار سے ایک ووٹ افسر کا ہے اور ایک ہی چپڑاسی کا ہے۔ چنانچہ انتظامی طور پر مرد کو فوقیت دی گئی ہے عورت پر لیکن شرفِ انسانیت (human dignity) میں دونوں برابر ہیں' ان میں کوئی فرق نہیں۔ اسلام نے تو یہ سبق پڑھایا لیکن یہودیوں نے اس کو آگے بڑھایا کہ مرد اور عورت بالکل برابر ہیں۔ ایک جیسے امور سرانجام دے سکتے ہیں۔ کندھے سے کندھا ملا کر کام کر سکتے ہیں۔ دو مرد آپس میں شادیاں کر سکتے ہیں' دو عورتیں آپس میں شادیاں کر سکتی ہیں۔ یہ سارا فساد اصل میں یہودیوں نے پھیلایا۔ یوں سمجھیے کہ ہسپانیہ کی یونیورسٹیوں سے علم وحکمت کے دریا چل رہے تھے' خاص طور پر ان تین ممالک میں جسے سنٹرل یورپ کہتے ہیں یعنی فرانس' جرمنی اور اٹلی۔ ایسے میں وہ جو قتیل شفائی نے کہا ہے ع ''کون سیاہی گھول رہا تھا وقت کے بہتے دریا میں!'' درحقیقت صاف اور پاک اسلامی تعلیمات میں یہودیوں نے سیاہی گھول لی۔ اس کے نتیجے میں جو لبرل ازم پیدا ہوا' اس کے ذریعے سے انہوں نے عیسائیوں سے بھرپور انتقام لیا۔

العِلمُ عِلمان

اس علم نے تین شکلیں اختیار کیں۔ جب پوپ کی طرف سے آزادی ہو گئی تو اب لوگوں نے سائنس اور فلسفہ پڑھنا شروع کر دیا۔ بڑے بڑے سائنس دان اور فلسفی پیدا ہو گئے۔ سائنس کے نتیجے میں ٹیکنالوجی آ گئی۔ اس سے یورپ کے اندر ایک پاور پوٹینشل develop ہو گیا۔ البتہ یہ علم یک چشمی تھا' جیسے ہم کہتے ہیں دجال کی ایک آنکھ ہے۔ اللہ نے علم کے ضمن میں انسان کو دو آنکھیں دی تھیں۔ ایک یہ کہ اپنے حواسِ ظاہری اور عقل سے علم حاصل کرو۔ ہمارے آباء واَجداد میں سے کسی شخص نے دیکھا کہ ایک چٹان گری' نیچے پتھر تھا تو دونوں کے ٹکرانے سے ایک شعلہ نکلا۔ یہ دیکھ کر اُس نے دو پتھر ہاتھ میں لے کر آپس میں رگڑے تو اس سے بھی شعلہ پیدا ہو گیا۔ یوں آگ ایجاد ہو گئی۔ اس

سے پہلے انسان صرف پھلوں اور پھولوں پر گزارا کرتا تھا یا کچا گوشت کھاتا تھا‘ آگ تو تھی نہیں۔ اب یہ بہت بڑی شے پیدا ہوگئی۔ پھر کسی نے دیکھا کہ چولھے پر ہانڈی چڑھی ہوئی ہے اور اس کا ڈھکنا ہل رہا ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس کے نیچے جو بھاپ (steam) پیدا ہو رہی ہے اس میں یہ طاقت ہے کہ وہ ہلا رہی ہے۔ لہٰذا اسٹیم سیکنڈ سورس آف انرجی ایجاد ہوگئی۔ اب سٹیم انجن بن گئے‘ ریل گاڑیاں دوڑنے لگیں۔ چنانچہ ایک علم یہ تھا کہ آنکھ سے دیکھو‘ کان سے سنو اور دماغ سے اس کو پراسس کرو۔ یہ کمپیوٹر جو اللہ نے تمہیں دے رکھا ہے‘ اس کے اندر اپنا سینس ڈیٹا فیڈ کرو یعنی آنکھوں‘ کانوں‘ زبان‘ ناک اور ہاتھ وغیرہ کا ڈیٹا فیڈ کرو تو یہ پراسس کرے گا۔ اس طرح علم قدم بقدم آگے بڑھتا گیا۔

علم کے دوسرے ماخذ کے حوالے سے اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ وہ وحی کے ذریعے آئے گا۔ سورۃ البقرۃ کے چوتھے رکوع کے مطابق‘ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے کہا کہ اب تم زمین کا چارج سنبھالو کہ تمہیں وہاں کا خلیفہ بنایا گیا ہے‘ تو ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا گیا:

﴿فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝۳۸ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۳۹﴾

”پھر جب بھی آئے تمہارے پاس میری جانب سے کوئی ہدایت‘ تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ حزن سے دوچار ہوں گے۔ اور جو کفر کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے وہ آگ والے (جہنمی) ہوں گے‘ اس میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔“

وحی کے ذریعے سے انبیاء و رسلؑ کے پاس مکمل ہدایت آتی رہے گی کہ کیا اوامر ہیں اور کیا نواہی۔

چنانچہ اللہ نے یہ دو آنکھیں دی تھیں۔ یورپ نے ایک آنکھ بند کر لی‘ یعنی آسمانی ہدایت سے منہ موڑ لیا۔ دوسری آنکھ پوری کھول دی کہ دیکھو‘ سنو اور نتیجہ نکالو۔ آگے بڑھو۔ فورسز آف نیچر کو قابو (conquer) کرو۔ harness کرو‘ ایکسپلائٹ کرو‘ انہیں استعمال کرو اور آگے بڑھتے چلے جاؤ۔ اس کو میں کہہ رہا ہوں یک چشمی علم‘ ایک آنکھ والا‘ کانا علم۔ انہوں نے دوسرے ذریعۂ علم یعنی وحی سے آنکھ بند کر لی۔ اس علم نے دنیا کے اندر طاقت

پکڑی اور پھر جو کچھ یہودیوں نے یورپ میں کیا تھا‘ وہ گلوبلائز ہوگیا۔ یہ تین چیزیں ہیں۔

یک چشمی علم کے ثمرات

ایک تو سیاست‘ ریاست اور معاشرے سے خدا کا کوئی تعلق نہیں۔ انسان کی خود مختاری (human sovereignty) اور عوامی اقتدارِ اعلیٰ (popular sovereignty) کی بنیاد پر جمہوریت ہوگی۔ سیکولرازم کا نظام نافذ ہوگا۔ مذہب صرف مسجدوں‘ مندروں‘ سناگوگز اور چرچز میں بند رہے گا۔ جہاں چاہو جاؤ۔ کسی ملک کے سیاسی‘ معاشرتی اور اقتصادی نظام (Socio-Politico-Economic System) سے کسی مذہب کو کوئی سروکار نہیں ہوگا۔ ہم خود مختار ہیں اور جو چاہیں گے‘ قانون بنائیں گے۔ اس شے کا نام جمہوریت ہے۔ یہ اب عالمی سطح پر رائج ہو چکا ہے۔ اقبال نے اسی کے بارے میں کہا:

ع ”تُو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری!“ یہ نیلم پری یعنی جمہوریت آج سب کی محبوبہ ہے۔ ہمارے ہاں بھی بعض دانشوروں اور کالم نویسوں کی تان آخر میں جمہوریت ہی پر ٹوٹتی ہے کہ بس یہی اصل شے ہے۔ یہ دراصل خدا سے بغاوت ہے کہ وہ نہ ہماری پارلیمنٹ میں آئے‘ نہ ہماری کورٹ میں آئے‘ نہ ہمارے بازار میں آئے‘ نہ ہمارے بینک میں آئے اور نہ گھریلو نظام میں آئے۔ وہ بس مسجد ہی میں رہے‘ ہم وہاں آ کر رکوع و سجود کر لیں گے۔ یا فلاں بت رکھا رہے کسی مندر میں‘ وہاں ڈنڈوت کر لیں گے۔ یہ خدا کے خلاف تاریخ انسانی کی سب سے بڑی بغاوت تھی۔

دوسرا معاملہ معیشت کا تھا۔ یورپ میں چرچ کی حاکمیت کے دوران ہر طرح کا سود حرام تھا۔ کمرشل انٹرسٹ بھی حرام تھا اور usury بھی جو کہ لوگ اپنے ذاتی استعمال کے لیے لے لیتے تھے۔ کیلون نامی ایک شخص نے ایک کتاب لکھی اور یہودیوں کے زیر اثر انٹرسٹ کی اجازت حاصل کر لی گئی۔ چنانچہ بغاوت ہوگئی۔ ایک بغاوت تو ہوئی جبکہ چرچ آف انگلینڈ آزاد ہو گیا۔ اس نے کہا کہ ہم رومن کیتھولک چرچ کو نہیں مانتے۔ پھر اسی کے نتیجے میں بینک آف انگلینڈ قائم ہوا۔ دنیا میں سودی کاروبار کا آغاز ہوا۔ یہودیوں نے بینکنگ نظام شروع کر کے پورے یورپ کو جکڑ لیا۔ یہ سازشیں کر کے ملکوں کو لڑاتے تھے۔ جنگ

کے دوران انہیں پیسے کی ضرورت پڑتی تو ہتھیار خریدنے کے لیے یہود منہ مانگی شرح سود پر قرض دیتے اور خون چوستے تھے۔ چنانچہ انہوں نے یہاں تک حیثیت اختیار کر لی کہ علّامہ اقبال جب ۱۹۰۵ء میں انگلستان اور جرمنی گئے تو وہاں کے حالات دیکھ کر انہیں کہنا پڑا ع ’’فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے!‘‘ اُس وقت فرنگ کا امام برطانیہ تھا‘ جس کے بارے میں کہتے تھے کہ اس کی سلطنت میں سورج کبھی غروب ہی نہیں ہوتا۔ آج اسی فرنگ کا امام امریکہ ہے اور وہ بھی اسی طرح پنجۂ یہود میں جکڑا ہوا ہے۔ سارے مالیاتی نظام‘ سارے بینکنگ نظام پر یہود چھائے ہوئے ہیں۔ اس وقت امریکہ سب سے زیادہ مقروض یہودی بینکاروں کا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کے ہاتھ میں نکیل ہے۔ جدھر چاہتے ہیں‘ موڑ دیتے ہیں۔ اس سود پر مبنی سرمایہ داری (Interest-based Capitalism) میں جو بھی جائز ہے‘ انسان کے جنسی جذبات کو بھڑکا کر کمائی کرنا بھی جائز ہے‘ شراب اور منشیات کے ذرائع سے آمدنی بھی جائز ہے۔ آج یہ لحاف بھی پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے۔ چین کچھ بچا ہوا تھا لیکن رفتہ رفتہ مارکیٹ اکانومی اور پرسنل پراپرٹی کے باعث وہ بھی اسی میں ضم ہو رہا ہے۔

یہود کا تیسرا کارنامہ یہ تھا کہ انسان سے شرم وحیا‘ عصمت وعفت کے سارے تصورات کو ختم کر دیا جائے۔ اسے حیوان کی سطح پر لے آیا جائے۔ ایک کتے کو شہوت ہے تو اسے کوئی بھی کتیا مل جائے‘ چاہے وہ اُس کی ماں ہو چاہے بیٹی ہو‘ اس سے استفادہ کر لے گا۔ یہ انسانوں نے کیا قدغنیں لگا رکھی ہیں کہ وہ ماں ہے‘ وہ بیٹی ہے‘ وہ بیوی ہے۔ یہ سب بنیادی طور پر عورتیں ہی ہیں۔ یوں خاندانی نظام کی جڑیں کھود ڈالی گئیں۔ تالمود یہود کی فقہ کی کتاب ہے۔ اس کی تعلیم یہ ہے کہ اصل انسان صرف ہم یہودی ہیں‘ باقی تمام لوگ Goyims اور Gentiles ہیں۔ یہ اصل میں انسان نما حیوان ہیں‘ جبکہ حیوان کو استعمال کرنا‘ ایکسپلائٹ کرنا انسان کا حق ہے۔ گھوڑے کو تانگے میں باندھتے ہیں اور بیل کو ہل میں جوتا جاتا ہے۔ اسی طرح تمام انسانوں کا خون چوسنا‘ ان کا استحصال کرنا‘ انہیں استعمال کرنا ہمارا حق ہے۔ اس کے لیے بہترین طریقہ یہ ہے کہ

انہیں واقعتاً حیوان بنا دیا جائے۔ انسانی اقدار ان سے چھین لی جائیں۔ حیوان بنیں گے تو پھر ہماری مرضی کے مطابق کام کریں گے۔ جو کام وہ کریں گے اس کی پیداوار کی ملائی اور مکھن ہم سود کے ذریعے کھینچتے چلے جائیں گے جبکہ چھاچھ انہیں دے دیں گے‘ کیونکہ آخر انہیں بھی زندہ رکھنا ہے۔ وہ زندہ رہیں گے تو اگلے دن کوئی کام کریں گے۔ گھوڑے کو بھی شام کو چارہ ڈالتے ہیں‘ تبھی اگلے دن اس کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہ ان کا تیسرا فلسفہ تھا۔ یہود یہ انتقام یورپ‘ امریکہ اور عیسائیوں سے بھرپور طریقے پر لے چکے ہیں۔ وہاں اب شرم اور حیا نام کی کوئی شے نہیں ہے۔ عصمت وعفت کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔

صدر کلنٹن نے اپنے پہلے سٹیٹ آف دی یونین ایڈریس میں کہا تھا: ’’عنقریب ہماری اکثریت حرام زادوں پر مشتمل ہوگی۔‘‘ یہ حرام زادے کا لفظ میں نے ترجمہ کیا ہے ورنہ اُس نے کہا تھا: born without any wedlock۔ شادی کے بغیر جو اولاد ہو رہی ہے تو یہ حرامی ہیں‘ حرام زادے ہیں۔ چنانچہ اس نے کہا کہ عنقریب ہماری اکثریت حرام زادوں پر مشتمل ہوگی۔ Homosexuality‘ lesbians‘ gays کے حوالے سے وہ باقاعدہ ڈیکلیر کرتے ہیں۔ پادری ڈیکلیر کرتا ہے کہ میں gay ہوں۔ سینیٹر ڈیکلیر کرتا ہے کہ میں gay ہوں۔ انہیں اس میں کوئی شرم نہیں ہے‘ کوئی حجاب نہیں۔ اعتراف کرنے میں کہیں بھی کوئی رکاوٹ اور ہچکچاہٹ نہیں ہے۔ یہ ہے جس کو کہا جائے گا: permissive hedonism۔ جنسی لذت ہر طریقے سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ زنا بالرضا ہو تو کوئی جرم ہے ہی نہیں‘ البتہ زنا بالجبر جرم ہے۔ ساری اقدار کو انہوں نے اس طریقے سے ملیامیٹ کر دیا ہے۔

ان کا یہ تیسرا معاملہ عالمِ اسلام کی حد تک پورا نہیں ہو سکا۔ ہمارے ہاں کچھ حد تک خاندانی نظام کی بنیادیں ابھی قائم ہیں۔ والدین کا ادب ہے‘ ان کی عزت ہے۔ ان کی خدمت کو انسان اپنے لیے سعادت سمجھتا ہے۔ بیوی اور شوہر کے درمیان عمومی طور پر باہمی الفت‘ محبت اور اعتماد کی فضا ہے۔ خاندانی نظام کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ اگرچہ ہمارا نظام بھی تیزی سے بگڑ رہا ہے اور ایلیٹ طبقہ مغرب کی طرز پر جا چکا ہے لیکن مڈل اور

لوئر کلاسز میں ابھی کچھ اقدار برقرار ہیں۔ شرم وحیا اور عصمت وعفت کی پاس داری ہے۔ البتہ زوردار طریقے سے یہ مہم چلائی جا رہی ہے کہ مسلمان ممالک سے بھی یہ ساری اقدار ختم کر دی جائیں۔ قرآن مجید نے دو جگہ پر اہلِ مکّہ کو متنبّہ (warn) کیا تھا:

﴿اَوَلَمۡ یَرَوۡا اَنَّا نَاۡتِی الۡاَرۡضَ نَنۡقُصُہَا مِنۡ اَطۡرَافِہَا ؕ﴾ (الرعد:۴۱)

’’کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں کہ ہم زمین کو گھٹاتے چلے آرہے ہیں اس کے کناروں سے؟‘‘

کیا یہ قریش دیکھ نہیں رہے کہ ہم رفتہ رفتہ ان کی طرف بڑھ رہے ہیں‘ چاروں طرف سے ان کے گرد ہمارا گھیرا تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ ان کے گرد جو قبائل آباد ہیں وہ مسلمانوں کے حلیف بنتے جا رہے ہیں۔ اسی طرح سورۃ الانبیاء میں فرمایا:

﴿اَفَلَا یَرَوۡنَ اَنَّا نَاۡتِی الۡاَرۡضَ نَنۡقُصُہَا مِنۡ اَطۡرَافِہَا ؕ﴾ (آیت ۴۴)

’’کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں کہ ہم زمین کو اس کے کناروں سے گھٹاتے چلے آرہے ہیں؟‘‘

اسلام رفتہ رفتہ کُفّارِ مکہ کے لیے گھیرا تنگ کر رہا تھا۔ آج اس کے برعکس ہے کہ یہودیوں کے زیر اثر مغرب اور امریکہ کی عظیم قوت کو استعمال کرتے ہوئے ہمارے لیے گھیرا تنگ کیا جا رہا ہے تاکہ ہمارا معاشرتی نظام بھی تلپٹ ہو جائے‘ درہم برہم ہو جائے۔ ہماری اقدار بھی ختم ہو جائیں۔ ہمارے ہاں بھی عورت اور مرد بالکل برابر ہونے کے مدّعی ہو کر میدان میں آ جائیں۔ عورت مرد بن جائے اور مرد عورت بن جائے۔ مَردوں (gays) کی آپس میں شادیاں ہو جائیں کہ ایک مرد شوہر اور ایک مرد بیوی‘ اور یہ شادی رجسٹر ہو جائے۔ عورتوں (lesbians) کی شادیاں ہو جائیں کہ ایک عورت شوہر اور ایک عورت بیوی‘ شادی رجسٹر ہو جائے۔

اس پروگرام کے تحت سب سے پہلے ۱۹۹۴ء میں قاہرہ میں ایک کانفرنس ہوئی جو عرب دنیا کا مرکز ہے۔ عربوں میں تعلیم اور ٹیکنالوجی کے اعتبار سے سب سے آگے مصر ہی ہے۔ یہ چونکہ ثقافتی اعتبار سے عربوں کا امام ہے‘ اس لیے وہاں جا کر ڈیرا لگایا گیا اور

ان افکار ونظریات کا پرچار کیا گیا۔ ایک سال کے بعد بیجنگ میں کانفرنس کر دی تاکہ ایک اور طرف سے گھیرا ڈالا جائے اور عالَمِ اسلام کے ایشیائی حصے پر اثر انداز ہوا جائے۔ اس کے بعد جون ۲۰۰۰ء میں ’’بیجنگ پلس فائیو‘‘ کانفرنس اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کے تحت ہوئی۔ اس کانفرنس کا موضوع تھا:

Women 2000: Gender Equality, Development and Peace for the 21st Century

بیجنگ پلس فائیو کانفرنس کا ایجنڈا

اس کانفرنس میں ایجنڈے کے طور پر سفارشات کا جو پرچہ تیار کیا گیا تھا وہ میں آپ کو بتا رہا ہوں۔ لندن سے ایک رسالہ Impact نکلتا ہے‘ یہ چیزیں میں نے اس سے لی ہیں۔ ہم نے ایک دفعہ انگریزی میں بڑی تعداد میں اس کو شائع کر کے تقسیم بھی کیا تھا۔ اس کانفرنس میں یہ فیصلے ہوئے تھے کہ:

(۱) ہم جنس پرستی کو ایک نارمل sexual orientation قرار دیا جائے۔ یہ کوئی جرم نہیں ہے۔ مرد‘ مرد سے شہوت رانی کرے۔ عملِ قومِ لوط حرام نہیں بلکہ نارمل orientation ہے۔ یہ انسان کا مزاج ہے۔ ایک شخص عورت سے اپنی خواہش پوری کرنا چاہتا ہے یا کسی مرد سے‘ اس معاملے میں کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔

(۲) ہم جنس پرست شادیوں کو تسلیم کیا جائے۔ اور یہ اب ہو رہا ہے۔ امریکہ کی کئی ریاستوں میں رجسٹریشن شروع ہو چکی ہے۔ یورپ اور سکینڈے نیوین ممالک میں تو پہلے سے ہے۔

(۳) عورتیں گھر کا کام کاج کرنے سے انکار کر دیں یا اس پر اجرت (wage) طلب کریں۔ یہ چولھا جھونکنا‘ روٹی پکانا‘ برتن دھونا اس کے لیے معاوضہ طے ہونا چاہیے۔

(۴) عورتیں حمل یا وضع حمل میں جو تکلیف برداشت کریں‘ اس پر بھی شوہر سے حق محنت وصول کریں۔

(۵) اگر کسی وقت عورت کی طبیعت ہم بستری کے لیے آمادہ نہ ہو اور شوہر مجبور کرے تو اسے marital rape قرار دیا جائے۔ یہ زنا بالجبر کے مترادف ہوگا۔

(۶) قحبہ گری (prostitution) کو ایک باعزّت پیشہ مانا جائے۔ اس پیشے سے منسلک خواتین کو طوائف نہیں بلکہ sex workers کہا جائے۔ جیسے مرد مختلف شعبوں میں اپنی جسمانی صلاحیتیں استعمال کر کے رزق کماتا ہے اسی طرح عورت بھی اپنے جسم کو استعمال کر کے پیسے لیتی ہے۔ یہ اس کا پیشہ ہے جسے باعزّت قرار دیا جائے۔ اس پر قطعاً کوئی قدغن نہ ہو۔

(۷) وراثت اور طلاق کے امور میں مرد اور عورت کے درمیان بالکل برابری ہو‘ کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ نکتہ اسلام ہی کو ہدف بنا کر ایجنڈے میں شامل کیا گیا۔

اس کا نام رکھا گیا: سوشل انجینئرنگ (معاشرتی تعمیرِ نو)۔ مولانا روم نے کہا تھا کہ ’’اوّل آں بنیاد را ویراں کنند!‘‘ پہلی بنیادوں کو اکھاڑ کر ہی نئی عمارت تعمیر کی جاتی ہے۔ لہٰذا موجودہ سوشل سٹرکچر ختم کر کے جو نئی سوشل انجینئرنگ کرنی ہے‘ اس کا سب سے بڑا ٹارگٹ عالمِ اسلام ہے۔ یہ تین کانفرنسیں ۱۹۹۴ء‘ ۱۹۹۵ء اور ۲۰۰۰ء میں ہوئیں۔

رینڈ کارپوریشن کی سفارشات

اب ایک نیا شوشہ آیا ہے۔ امریکہ کا ایک بہت بڑا تھنک ٹینک ہے: ’’رینڈ (RAND) کارپوریشن‘‘۔ اس کی سفارشات محکمہ دفاع اور محکمہ خارجہ کو جاتی ہیں۔ اس تھنک ٹینک کے مشوروں اور تجاویز کو حکومت غور سے دیکھتی ہے اور عمل کرتی ہے۔ اب انہوں نے یہ تجزیہ کیا ہے کہ مسلمان چار قسم کے ہیں:

(۱) بنیاد پرست (Fundamentalist)‘ جو اسلام کو صرف مذہب نہیں بلکہ ایک دین سمجھتے ہیں۔ وہ یہ یقین رکھتے ہیں کہ اسلام صرف عقیدے‘ عبادات اور رسومات کا نام نہیں بلکہ ایک politico-socio-economic system ہے‘ ایک اجتماعی نظام ہے۔ اس طبقے کے لوگ ہمارے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ انہیں ہم نے ہر قیمت پر ختم کرنا ہے۔

They are the biggest challenge to our civilization, our culture, our system.

(۲) روایت پسند (Traditionalist) طبقہ‘ جو علماء پر مشتمل ہے۔ یہ قال اللہ وقال الرسول میں مشغول ہیں۔ ان کا اصل مشغلہ دار العلوم ہے‘ پڑھنا پڑھانا ہے۔ مساجد میں خطبہ دینا ہے‘ امامت کرانی ہے۔ اس سے بڑھ کر ان کے سامنے اسلام کا کوئی concept نہیں ہے۔ لہٰذا یہ ہمارے لیے خطرناک نہیں ہیں۔ They are no challenge to us۔ البتہ اگر وہ کبھی بنیاد پرستوں کے ساتھ مل گئے تو پھر بہت خطرناک ثابت ہوں گے‘ کیونکہ ان کے پاس عوام تک رسائی کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ ہر جمعہ کو ایک طرح کا جلسہ ہو رہا ہے۔ اگر چھوٹا سا اجتماع بھی کرنا ہو تو ہزاروں روپے خرچ کرنے پڑتے ہیں۔ اشتہار‘ پوسٹر وغیرہ لگانے پڑتے ہیں۔ یہاں تو لوگ نہا دھو کر‘ اچھے کپڑے پہن کر اور عطر بھی لگا کر آ رہے ہیں۔ گویا کچے دھاگے میں بندھے ہوئے ہیں۔ ان کے پاس تو بڑا ذریعہ ہے۔ لہٰذا اوّلاً ان کو ایک دوسرے سے دور رکھو۔ اپنے مسلکی و فرقہ وارانہ اختلافات میں الجھائے رکھو۔ شوشے چھوڑتے رہو تا کہ وہ انہی مباحث کے اندر مناظرے بازی میں لگے رہیں۔

(۳) جدیدیت پسند (Modernist): یہ وہ لوگ ہیں جو اسلام کی جدید تعبیر کر رہے ہیں اور اسے ہماری تہذیب کے ساتھ ہم آہنگ (compatible) بنا رہے ہیں۔ ان کی مدد کرو‘ انہیں سپورٹ کرو‘ انہیں پیسہ دو۔ خاص طور پر پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا میں ان کے لیے رسائی کا بندوبست کرو‘ اس لیے کہ ان کے پاس کوئی اور ذریعہ تو ہے نہیں۔ ان میں سے کسی کو کوئی مسجد میں خطیب بنا کر تو کھڑا نہیں کرے گا بلکہ شاید وہاں یہ داخل بھی نہ ہو سکیں۔ ان کے لیے ذریعہ چاہیے تا کہ عوام تک پہنچیں۔ آج کا سب سے بڑا ذریعہ ٹیلی ویژن ہے‘ انہیں اس پر لاؤ۔ خاص طور پر ہمارا انگریزی پریس ان کا آلہ کار بنے اور میڈیا میں انہیں exposure دو۔

(۴) سیکولرسٹ: یہ پہلے ہی ہمارے ہیں‘ ہماری جیب میں ہیں۔ یہ تسلیم کر چکے ہیں کہ نظامِ زندگی کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مذہب محض عقیدہ‘ عبادات اور رسومات کا نام ہے۔

گویا کہ دو جمع دو تقسیم ہو گئی۔ دو کو سپورٹ کرو‘ مدد دو جبکہ دو کو suppress کرو اور

ایک دوسرے سے دور رکھو۔ روایت پسندوں کو اپنے اختلافات میں الجھائے رکھو۔ یہ ہے پالیسی جس کے تحت عجیب وغریب باتیں الیکٹرانک میڈیا اور ٹیلی ویژن سے سننے میں آ رہی ہیں۔ بڑے بڑے دانشور کہہ رہے ہیں کہ اسلام میں شراب حرام نہیں ہے بلکہ شراب پی کر بالکل دھت ہو جانا‘ مدہوش ہو جانا حرام ہے۔ اس کے لیے مغرب میں drunkards کی اصطلاح ہے یعنی اتنا پی لینا کہ ہوش وحواس قابو میں نہ رہیں۔ انہیں وہاں بھی پسند نہیں کیا جاتا۔ وہ کہتے ہیں کہ اصلاً اسلام میں شراب حرام نہیں ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ علامہ اقبال کے فرزند نے یہ بات کہی ہے۔ پھر انہی کے ہم نام ایک جدیدیت پسند سکالر نے یہ شوشہ چھوڑا کہ قرآن میں پردہ نہیں ہے۔ پردہ تو ایک خاص وقت کی معاشرتی ضرورت تھی جس کے تحت کچھ احکام دیے گئے۔ ان کی کوئی مستقل حیثیت نہیں ہے۔ یہ ہے وہ صورت حال جس کی بنا پر میں نے اس موضوع کو اپنے لیے اختیار کیا ہے۔

اسلام میں پردے کے اَحکام

اب میں آ رہا ہوں کہ اسلام میں پردے کے احکام کیا ہیں‘ لیکن اس کے لیے پہلے چند تمہیدی مباحث ضروری ہیں۔

(۱) ہمارے نزدیک اسلام مذہب نہیں‘ دین ہے۔ اسلام کے لیے مذہب کا لفظ قرآن میں آیا ہی نہیں۔ جہاں تک مجھے حدیث کا علم ہے‘ وہاں بھی نہیں آیا۔ میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا اس لیے کہ حدیث کا ذخیرہ بہت بڑا ہے‘ لیکن جتنا کچھ پڑھا ہے وہاں مذہب کا لفظ نہیں دیکھا۔ ہمارے اسلاف میں مذہب کی اصطلاح حنفی‘ مالکی‘ شافعی‘ حنبلی مسالک کے لیے استعمال ہوئی ہے۔ اس کے بعد ایک اور مذہب سلفی آیا‘ جو اہلِ حدیث حضرات ہیں۔ دراصل مذاہب یہ ہیں جبکہ اسلام دین ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ ۟﴾ (آل عمران:۱۹) ’’یقیناً اللہ کے نزدیک دین تو بس اسلام ہی ہے۔‘‘

اسلام چھ چیزوں پر مشتمل ہے۔ اس میں ایمانیات بھی ہیں‘ عبادات بھی ہیں‘ رسومات بھی ہیں۔ بچہ پیدا ہوگا تو عقیقہ کریں گے۔ کوئی فوت ہو جائے گا تو نہلائیں گے‘ کفن دیں گے‘ نماز جنازہ پڑھیں گے‘ پھر دفن کریں گے۔ شادی ہوگی تو ایجاب وقبول

ہوگا‘ اعلانِ عام ہوگا۔ پھر اسلام میں سیاسی نظام ہے‘ معاشی نظام ہے‘ معاشرتی نظام ہے۔ اسلام کی حدود ہیں‘ قانونِ تعزیرات ہے‘ دیوانی قانون ہے۔ اسلام کا قانونِ وراثت ہے۔ اسلام کا قانونِ شہادت ہے۔ زندگی کا کوئی گوشہ نہیں ہے جس کے بارے میں اسلام نے ہمیں تعلیمات نہ دی ہوں۔ بہرحال اسلام مذہب بھی ہے لیکن یہ صرف مذہب نہیں ہے بلکہ حقیقتاً ایک دین ہے یعنی مذہب کے تینوں اجزاء اور socio-politico-economic سسٹم مل کر اسلام بنتا ہے۔

(۲) اسلام صرف قرآن پر قائم نہیں ہے۔ منکرینِ حدیث نے اپنا نام ’’اہلِ قرآن‘‘ رکھ کر مسلمانوں کو بہت بڑا دھوکا دیا ہے۔ وہ منکرینِ حدیث اور منکرینِ سنت ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ بس قرآن کافی ہے جبکہ حضورﷺ کی اطاعت کا بار بار جو حکم دیا گیا کہ ﴿اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ وہ محض اُس وقت کے امام اور لیڈر ہونے کی حیثیت سے ہے۔ آپﷺ کی زندگی میں اطاعت فرض تھی‘ یہ ہمیشہ کے لیے نہیں ہے۔ ہمارا یہ موقف نہیں ہے‘ اُمّت کا نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک اسلام کی دو بنیادیں ہیں: کتابُ اللّٰہِ وَسُنَّۃُ رَسُوْلِہٖ! اللہ کی کتاب اور اس کے رسولﷺ کی سنت۔ اللہ کا شکر ہے کہ پاکستان کے دستور میں شامل قراردادِ مقاصد کے اندر ان دونوں کا ذکر ہے۔ دفعہ ۲۲۷ میں کہا گیا:

No legislation will be done repugnant to the Quran and Sunnah.

یہ الگ بات ہے کہ اس میں ایسے چور دروازے موجود ہیں کہ پاکستان کا دستور منافقت کا پلندہ بن چکا ہے۔ ان دفعات کے ہوتے ہوئے بھی اسلام نافذ نہیں ہو رہا۔ یہ دفعات ineffective ہو چکی ہیں۔ تاہم عملاً اور نظری طور پر کم سے کم یہ ضرور ہے کہ ہمارے دستور میں کتاب وسنت دونوں کو تسلیم کیا گیا ہے۔

(۳) یہ بات بہت اہم ہے۔ قرآن پر تدبر کرنے میں دو پہلو ہمیشہ سامنے رہنے چاہئیں۔ ایک ہے اس کی تاویل خاص اور ایک ہے تاویل عام۔ قرآن ایک خاص دور میں اُترا۔ یہ ۶۱۰ء سے ۶۳۲ء تک ۲۲ برس میں حجاز میں نازل ہوا۔ مکی سورتیں ہیں تو مکّہ بھی

حجاز میں ہے‘ مدنی سورتیں ہیں تو مدینہ بھی حجاز میں ہے۔ سفر تبوک کے موقع پر آیات نازل ہوئی ہیں تو تبوک بھی حجاز کا آخری کونہ ہے۔ چنانچہ حجاز کے لوگ ہی اس کے اوّلین مخاطب تھے۔ قرآن مجید میں جو چیز بھی نازل ہوئی ہے‘ اس وقت کے ماحول کے ساتھ اس کی کوئی نہ کوئی نسبت تھی۔ تبھی وہ سمجھ سکتے تھے۔ یہ محض ہوا میں باتیں نہیں تھیں۔ البتہ یہ بھی حقیقت ہے کہ قرآن ابدالآباد تک کے لیے ہدایت ہے۔ یہ صرف اُس وقت کے لیے ہی ہدایت نہیں تھا بلکہ آج بھی یہی ہدایت ہے اور قیامت تک ہدایت رہے گا۔ علامہ اقبال جیسے مفکّر‘ مدبّر اور فلسفی کو بھی اگر ہدایت میں تسکین ملی ہے تو اسی کتاب سے: ؎

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی‘ جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرمِ خانہ خراب کو ترے عفو بندہ نواز میں

زندگی کے آخری دور میں وہ صرف قرآن پڑھتے تھے‘ کوئی فلسفے کی کتاب نہیں۔ لہٰذا قرآن میں بیسویں صدی کے فلسفی کے لیے بھی ہدایت ہے۔ کسی بھی زمانے کے اندر جو مسائل پیدا ہوں گے‘ ان سب کا حل موجود ہے۔

اب ان دونوں باتوں کو جوڑیے۔ اُس وقت قرآن ایک خاص ماحول میں خاص افراد سے مخاطب ہو کر نازل ہوا تو اس کا کچھ واقعاتی پس منظر بھی تھا۔ اگر اُس پس منظر میں قرآن کی آیات پر غور کیا جائے تو یہ تاویل خاص ہے۔ یہ ضروری ہے‘ کیونکہ اس سے insight حاصل ہوتی ہے۔ البتہ ایک ہے اس کی تاویل عام‘ جو ہمیشہ کے لیے ہے۔ چنانچہ اصول یہ ہے: الاعتبار لعموم اللفظ لا لخصوص السبب یعنی اصل اعتبار الفاظ کے عموم کا کیا جائے گا نہ کہ سببِ نزول کے خصوص کا۔ اعتبار کیا جائے گا ہمیشہ کے لیے‘ generalise کیا جائے گا کہ یہ احکام آئے ہیں۔ ان کے الفاظ کو دیکھیں گے‘ ان پر نگاہیں جمائیں گے اور اس سے احکام کا استنباط کریں گے۔

یہ تین باتیں ہو گئیں۔ ایک‘ اسلام صرف مذہب نہیں بلکہ دین ہے۔ دوسرے‘ اسلام صرف قرآن پر مبنی نہیں ہے۔ صرف قرآن پر تو نماز کا نظام بھی نہیں بنتا۔ اگر سنت کو نکال دیں تو دو آدمی بھی نماز پر متفق نہیں ہو سکتے۔ کس دلیل سے مغرب کی تین رکعتیں ہیں؟

قرآن میں سجدے اور رکوع کا ذکر تو ہے لیکن کیا کہیں یہ ترتیب لکھی ہے کہ پہلے تکبیر تحریمہ کہو‘ پھر کھڑے رہو‘ سورۃ الفاتحہ پڑھو اور سورت ملا کر رکوع میں جاؤ‘ پھر کھڑے ہو‘ پھر سجدے میں جاؤ؟ چودہ سو برس گزرنے کے باوجود کیا انڈونیشیا کے آخری جزیرے سے موریطانیہ تک نماز کے بارے میں کوئی اختلاف ہے؟ رکعتوں اور ان کی ترتیب کا اختلاف ہے؟ کوئی اختلاف نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ رفع الیدین کریں یا نہیں! آمین بلند آواز سے کہنی ہے یا زیرلب۔ ۱۹۶۲ء میں جب میں نے پہلا حج کیا تو مجھے اس چیز کا احساس ہوا۔ وہاں یہ نقشہ نظر آیا کہ مسلمان خانہ کعبہ کے گرد کھڑے ہوئے ہیں دائروں میں۔ ایک دائرہ‘ دوسرا‘ تیسرا‘ چوتھا۔ شیعہ بھی ہیں‘ سُنّی بھی ہیں‘ بریلوی بھی ہیں‘ دیوبندی بھی ہیں‘ اصحابِ ظاہر بھی ہیں‘ خارجی بھی آ گئے ہیں‘ سب ہیں لیکن کہیں بھی نماز کی ڈرل نہیں ٹوٹتی۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کا خیال ہوتا کہ رکعت میں رکوع ایک ہے تو سجدہ بھی ایک ہے‘ وہ ایک سجدہ کر کے کھڑا ہو جاتا اور دوسرا دوسرے سجدے میں گرا ہوا ہوتا تو نماز ٹوٹ جاتی۔ کھڑے ہونے والا کہتا کہ ع ”یہ ناداں گر گئے سجدوں میں جب وقتِ قیام آیا!“ اب تو کھڑے ہونے کا وقت تھا‘ یہ دوبارہ سجدے میں گر گئے۔ لیکن کہیں ایسا نہیں ہے۔ اتنے مسلک‘ اتنی قومیتیں‘ اتنے علاقے ہیں لیکن نماز ایک ہی ہے۔ کہیں ڈرل نہیں ٹوٹتی‘ جمعیت ختم نہیں ہوتی۔ یہ سب سنت کی برکت سے ہے۔ لہٰذا اسلام کی بنیاد قرآن وسنت پر ہے۔ قرآن پر تدبر کرنے اور استنباط کرنے کے لیے تاویلِ خاص پر بھی نظر ہونی چاہیے۔ آپ کو وہ پس منظر جاننا چاہیے کہ جس کے اندر وہ آیات نازل ہوئیں۔ لیکن ان کی عام تاویل کی جائے گی کہ ہمیشہ کے لیے اس سے کیا قانون مستنبط ہوتا ہے۔

عرب معاشرے کی خصوصیات

عرب کے جاہلی تمدن کا معاشرتی نظام کیا تھا؟ کیا وہاں عورتیں برہنہ رہتی تھیں؟ کیا وہاں کوئی خاندانی نظام نہیں تھا؟ یہ نہ سمجھیے کہ وہاں اس طرح کا کوئی خلا تھا بلکہ اس معاشرے میں بھی خصوصیات تھیں:

(۱) ان کا قبائلی نظام بہت مضبوط تھا اور ایسے حالات میں خاندانی نظام بھی بہت مستحکم

ہوتا ہے۔قبیلہ خاندانوں کے مجموعے ہی کا نام ہے۔

(۲) شرفاء کی خواتین میں عام لباس کے علاوہ دو چیزیں ان کے استعمال میں رہتی تھیں۔ ایک خمار(اوڑھنی)' گھروں کے اندر وہ اوڑھنی اوڑھتی تھیں۔ دوسرے جلباب (لمبی چادر) کہ جب باہر نکلتی تھیں تو اس میں اپنے پورے جسم کو لپیٹ لیتیں' لیکن چہرہ نہیں چھپاتی تھیں۔ جلباب کا لفظ قرآن میں آیا ہے: ﴿یُدۡنِیۡنَ عَلَیۡہِنَّ مِنۡ جَلَابِیۡبِہِنَّ ؕ﴾ (الاحزاب:۵۹)۔خمار کا ذکر بھی آیا ہے: ﴿وَلۡیَضۡرِبۡنَ بِخُمُرِہِنَّ عَلٰی جُیُوۡبِہِنَّ﴾ (النور:۳۱)۔ یہ الفاظ انہیں معلوم تھے' ان کے زیر استعمال تھے' ورنہ کوئی نیا لفظ کہاں سے آجاتا۔ چنانچہ جلباب اور خمار ان کے لباس کا حصہ تھا۔ البتہ گھر کے اندر کسی مخلوط اجتماع کی کوئی پابندی نہ تھی۔ عورتیں بھی ہیں' مرد بھی بیٹھے ہیں' خوش گپیاں ہو رہی ہیں۔ ساتھ مل کر کھانا کھا رہے ہیں۔ جیسے آج مغرب میں ہے۔ نہ ہی کوئی باہر کے مخلوط اجتماعات پر پابندی تھی۔ وہ ایک مخلوط معاشرہ تھا۔

(۳) البتہ وہاں کنیزوں کا ایک طبقہ تھا۔ کنیزیں' باندیاں' عام خادمائیں۔ انہیں جاریات (چھوکریاں) بھی کہہ دیتے تھے۔ ان کا معاملہ یہ تھا کہ ان کے لیے نہ کوئی خمار تھا نہ جلباب۔ یہ ننگے سر اور کھلے چہرے کے ساتھ آتی تھیں۔ ان کے لباس کوئی زیادہ ڈھکے ہوئے نہیں ہوتے تھے۔ بے پردگی' بے حیائی' عریانی اور بے شرمی ان میں عام تھی۔ لوگوں کو ان سے چھیڑ چھاڑ کرنے کا حق تھا۔ ان کے آقا ان سے جسم فروشی بھی کرواتے تھے جس کو قرآن نے سورۃ النور میں روکا ہے۔ وہ ان کو آمدنی کا ذریعہ بناتے تھے۔ جسم فروشی (prostitution) اور قحبہ گری ان میں عام تھی۔ اس طرح یہ دو طبقے ہو گئے۔ شرفاء کی خواتین اور عام کنیزیں۔

اسلام کی معاشرتی اصلاحات کے اہداف

اس پس منظر میں اسلام نے جو معاشرتی اصلاحات کی ہیں' ان کے اہداف یہ ہیں:

(۱) مضبوط خاندانی نظام: نظام شروع ہوتا ہے ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان

ازدواج سے۔ ان دونوں کے درمیان جتنی محبت ہوگی' جتنا قرب ہوگا' جتنا باہمی اعتماد ہوگا اتنا ہی خاندان مضبوط ہوگا۔ شوہر اور بیوی خاندان کی first dimension ہے۔ جب شوہر اور بیوی کو اللہ نے اولاد دے دی تو اب second dimension کا اضافہ ہوگیا۔ خاندان کے استحکام کے لیے ضروری ہے کہ اولاد والدین کا ادب کرے۔ بڑھاپے میں ان کی خدمت کرے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں تھی کہ اولاد سے محبت کرو' کیونکہ یہ تو دل میں ہے ہی۔ اس کے لیے تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ زیادہ محبت نہ کرو' کیونکہ ایسا کرنے سے بچے بگڑ جائیں گے۔ اولاد کی محبت کی وجہ سے حرام میں منہ مت مارو۔ قرآن کریم میں پانچ جگہ اللہ کے حق کے فوراً بعد والدین کا حق مذکور ہے۔ ارشاد ہوا:

﴿وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِیَّاہُ وَ بِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا ؕ﴾

(بنی اسراءیل:۲۳)

''اور فیصلہ کر دیا ہے آپؐ کے رب نے کہ مت عبادت کرو کسی کی سوائے اُس کے' اور والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرو۔''

﴿وَوَصَّیۡنَا الۡاِنۡسَانَ بِوَالِدَیۡہِ ۚ ...... اَنِ اشۡکُرۡ لِیۡ وَ لِوَالِدَیۡکَ ؕ﴾

(لقمان:۱۴)

''اور ہم نے وصیت کی انسان کو اُس کے والدین کے بارے میں...... کہ شکر کرو میرا (میں تمہارا خالق ہوں' تمہارا رب ہوں) اور اپنے والدین کا۔''

وہ تمہارے اس دنیا میں آنے کا ذریعہ بنے ہیں۔ جب تم چھوٹے تھے تو انہوں نے ہی پالا پوسا ہے۔ اپنا پیٹ کاٹ کر تمہیں کھلایا ہے۔ اپنی رات کی نیندیں حرام کر کے تمہیں پالا ہے۔ لہٰذا والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرو۔ تیسری جہت (dimension) یہ ہے کہ صلہ رحمی کرو۔ یہ خاندان کے تین ابعاد یا تین جہات (dimensions) ہیں۔ ان میں سے مؤخر الذکر دو میرا اس وقت کا موضوع نہیں ہیں۔

اگر شوہر اور بیوی کے درمیان اعتماد نہ ہو' شوہر کو یہ یقین نہ ہو کہ میں جب باہر جاتا ہوں تو میری بیوی کیا کرتی ہے اور بیوی کو یہ یقین نہ ہو کہ میرا شوہر جب باہر جاتا ہے تو کیا

کرتا ہے تو بداعتمادی کی فضا قائم ہو جائے گی۔ اگر شوہر کی نگاہ میں کوئی دوسری عورت کھب گئی ہے تو اب اس کی توجہ اپنی بیوی پر سے ہٹ جائے گی۔ اسے خواب میں بھی وہی نظر آئے گی۔ یوں شوہر اور بیوی کا bond of love کمزور ہوگا۔ اگر باپ کو یہ یقین نہ ہو کہ یہ اولاد میری ہی ہے تو اس خاندان کے ادارے میں دراڑیں پڑ جائیں گی۔ لہٰذا اس ادارے کو مضبوط رکھنے کے لیے سب سے اہم کام یہ ہے کہ مرد اور عورت میں جتنی بھی جنسی کشش ہے، وہ صرف شوہر اور بیوی کے درمیان ہی مرکوز (centered) رہے۔ انتشار نہ ہو۔ نگاہ اِدھر سے اُدھر نہ جائے بلکہ ان کی پوری توجہ ایک دوسرے کی طرف ہو۔ آپس میں اعتماد ہو، محبت ہو۔ اسی سے خاندان کی چولیں مضبوط رہیں گی۔

(۲) دوسرا ہدف یہ ہے کہ مَردوں اور عورتوں پر ان کی جسمانی اور نفسیاتی ساخت کے مطابق جداگانہ ذمہ داریاں ڈال دی گئیں۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ عورت کا جسم اور ہے جبکہ مرد کا کچھ اور۔ عورت کی نفسیات کچھ اور ہے، مرد کی نفسیات کچھ اور۔ ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ عورت کا حسن اس کی نزاکت میں ہے جبکہ مرد کا حسن اس کی جسمانی وجاہت میں ہے۔ اس اعتبار سے اسلام نے بھاری کام مرد کے ذمہ لگایا۔ ایک شخص آٹھ گھنٹے کسّی چلاتا ہے اور پھر اپنے گھر والوں کے لیے کچھ لے کر آتا ہے۔ کوئی سارا دن اینٹیں ڈھوتا ہے اور پھر کچھ لے کر آتا ہے۔ ملک کی سرحدوں کی حفاظت اور ان کا دفاع مردوں کے حوالے ہے۔ معاش کا معاملہ مردوں کے حوالے ہے، عورت کے نہیں۔ یہ عورت پر ظلم ہے کہ معاشی ذمہ داری بھی اس پر ڈال دی جائے۔ جسمانی حوالے سے اگر اس پر کوئی ذمہ داری اور مشقت ڈالی گئی ہے تو وہ حمل کو برداشت کرنا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿حَمَلَتْهُ أُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ ....﴾ (لقمان:۱۴)

''اس کو اٹھائے رکھا اُس کی ماں نے (اپنے پیٹ میں) کمزوری پر کمزوری جھیل کر، اور اُس کا دودھ چھڑانا ہوا دو سال میں ....''

بچے کو دودھ پلانا ماں کے ذمہ ہے۔ رات کو بچہ روتا ہے تو ماں جاگتی ہے، باپ نہیں۔ ماں

اپنی نیند حرام کر دے گی۔ چنانچہ کسی قوم کا حال مردوں کے اور مستقبل عورتوں کے حوالے ہے۔ مستقبل ہے اگلی نسل۔ وہ عورت کے رحم میں وجود پائے گی۔ عورت کی گود میں پرورش پائے گی۔ مستقبل کا سارا بوجھ عورت پر جبکہ حال کی ساری ذمہ داریاں مرد کے اوپر ہیں۔

(۳) یہ بہت بڑا ہدف ہے کہ جنسی انضباط (sex discipline) ہو، زنا کی روک تھام ہو۔ از روئے الفاظ قرآنی:

﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۭ وَسَاۗءَ سَبِيْلًا ۳۲﴾ (بنی اسرائیل)

''اور زنا کے قریب بھی مت پھٹکو، یقیناً یہ بہت بے حیائی کا کام ہے، اور بہت ہی برا راستہ ہے۔''

یہ نہیں کہا کہ ''لَا تَزْنُوْا'' کہ زنا مت کرو، بلکہ حکم ہوا کہ اس کے قریب تک نہ پھٹکو! جیسے فیصل آباد کا گھنٹہ گھر ہے جہاں آٹھ بازار مل رہے ہیں۔ اب اگر کوئی سرکاری طور پر یہ اہتمام کرنا ہے کہ اس کلاک ٹاور تک کوئی جلوس نہ پہنچے تو آٹھوں بازاروں کو بند کرنا ہوگا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے دُور دُور تک وہ حدیں لگا دی ہیں کہ زنا کی ترغیب نہ ہو، زنا کے راستے مسدود ہو جائیں۔ جدید نفسیات کا بانی فرائڈ کو مانا جاتا ہے، جس کے نزدیک انسان کے محرکاتِ عمل میں سب سے زیادہ طاقتور، سب سے زیادہ potent سیکس ہے۔ مارکس نے معاشی ضرورت کو قرار دیا، لیکن فرائڈ نے کہا کہ نہیں، اصل شے سیکس ہے۔ وہ تو یہاں تک کہتا ہے کہ باپ اگر محبت بھری نگاہ سے بیٹی کو دیکھ رہا ہے تو اس کا محرک بھی جنسی جذبہ ہے اور اسی طرح اگر ماں بیٹے سے محبت کر رہی ہے تو یہ بھی شہوت کی وجہ سے ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون! ان کمبختوں کا معاملہ یہ ہے کہ ایک شے پر نگاہ جم گئی تو سب کچھ اسی کے گرد گھما دیا۔ ورنہ بنیادی طور پر بات کچھ اتنی غلط نہیں ہے۔ اس میں قطعاً کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ جنسی داعیہ انسان کے طاقت ور ترین داعیات میں سے ایک ہے۔ اگر عورت میں مرد کے لیے کشش نہ ہو، اگر عورت کو مرد کی احتیاج نہ ہو تو تمدن ختم ہو جائے۔ پھر کون شادی کا کھکیڑ مول لے گا؟ ایک پیٹ پالنا اور شے ہے، جبکہ ایک خاندان کی ذِمہ داری کا بوجھ اٹھانا بالکل دوسری چیز۔ یہ جس قدر شدید اندرونی کشش ہے، اس اعتبار سے سمجھیے کہ جتنا زوردار گھوڑا ہو

اتنی ہی زوردار لگام چاہیے۔ لہٰذا اس جنسی جذبے کو ڈسپلن میں لانے کے لیے لازم ہے کہ ایک مرد اور عورت کے درمیان قانونی تعلق ہو' ازدواج ہو' شادی ہو جائے۔ یا پھر دوسرا راستہ وہ تھا جو آج کل نہیں رہا' یعنی کسی کی باندی ہو' مِلکِ یمین ہو۔ ان کے مابین جنسی ملاپ (sexual intercourse) ہو اور اس سے باہر نگاہ بھی نہ جائے۔

قرآن اور صاحبِ قرآنﷺ کی حقیقت پسندی

ذرا دیکھیے کہ قرآن مجید اور رسول اللہ ﷺ کس قدر حقیقت پسند ہیں۔ سورۃ آلِ عمران میں فرمایا گیا:

﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ﴾ (آیت ۱۳)

'' مزیّن کر دی گئی ہے لوگوں کے لیے مرغوباتِ دنیا کی محبت جیسے عورتیں اور بیٹے اور جمع کیے ہوئے خزانے سونے اور چاندی کے اور نشان زدہ گھوڑے اور مال مویشی اور کھیتی۔''

اسی طرح حضور ﷺ کی ایک حدیث سنن نسائی' مسند احمد' حاکم اور بیہقی میں الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ آئی ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((حُبِّبَ إِلَيَّ مِنْ دُنْيَاكُمْ ثَلَاثٌ: اَلطِّيبُ وَالنِّسَاءُ، وَجُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلَاةِ))

'' تمہاری دنیا کی چیزوں میں سے تین چیزیں میرے لیے محبوب بنا دی گئی ہیں: خوشبو اور عورتیں' اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے۔''

حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ تمہاری اس دنیا میں سے مجھے تین چیزیں محبوب کر دی گئی ہیں۔ یہاں دوسرے نمبر پر آپ ﷺ نے ''نساء'' کا ذکر فرمایا۔ (بقولِ اقبال: ع ذکرِ اُوفرمود با طیب وصلاۃ) یہ بیان کرنے میں کیا آپ ﷺ نے کسی جھجک سے کام لیا؟ جو

حقیقت ہے' اس کا اعتراف کرنا چاہیے۔

اسی طرح سورۃ الاحزاب میں حضور ﷺ سے خطاب میں واضح الفاظ آئے ہیں:

﴿لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ ……﴾

'' اب اس کے بعد اور عورتیں آپؐ کے لیے حلال نہیں اور نہ ہی (اس کی اجازت ہے کہ) آپؐ ان میں سے کسی کی جگہ کوئی اور بیوی لے آئیں اگرچہ اُن کا حسن آپ کو اچھا لگے……''

اللہ تعالیٰ نے بھی یہ الفاظ ارشاد فرماتے ہوئے جھجک سے کام نہیں لیا کہ اے نبی ﷺ! خواہ عورتوں کا حسن آپ کو بھلا لگے' لیکن اب آئندہ شادی کی اجازت نہیں۔

میں فرائڈ کی اس حد تک تائید کر رہا ہوں کہ جنسی جذبہ بہت زوردار محرک ہے' البتہ اس گدھے نے جو آگے تک معاملہ پہنچا دیا ہے وہ غلط ہے۔

زنا کے مراتب و مدارج

اب زنا کے بارے میں حضور ﷺ نے جو فرمایا وہ بھی سن لیجیے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((إِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ عَلَى ابْنِ آدَمَ حَظَّهُ مِنَ الزِّنَا، أَدْرَكَ ذٰلِكَ لَا مَحَالَةَ، فَزِنَا الْعَيْنَيْنِ النَّظَرُ، وَزِنَا اللِّسَانِ النُّطْقُ، وَالنَّفْسُ تَمَنّٰى وَتَشْتَهِي، وَالْفَرْجُ يُصَدِّقُ ذٰلِكَ أَوْ يُكَذِّبُهُ))

(صحیح البخاری: ۶۲۴۳، صحیح مسلم: ۶۷۵۳)

'' اللہ تعالیٰ نے ابن آدم پر اس کے حصے کا زنا لکھ دیا ہے' وہ لامحالہ اپنا حصہ لے کر رہے گا۔ آنکھ کا زنا (نامحرم عورت کو) دیکھنا ہے۔ زبان کا زنا (حرام بات) کہنا ہے۔ دل تمنا رکھتا ہے' خواہش کرتا ہے' پھر شرم گاہ اس کی تصدیق کرتی ہے (اور وہ زنا کا ارتکاب کر لیتا ہے) یا تکذیب کرتی ہے (اور وہ اس کا ارتکاب نہیں کرتا)۔''

اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے لیے زنا میں سے ایک حصہ لکھ دیا ہے جو اس کو پہنچ

کررہے گا۔ آنکھوں کا زنا نامحرم عورت کو دیکھنا ہے۔ اگر زنا کو پوری طرح روکنا ہے تو یہاں پر بھی قدغن لگے گی۔ حدیث میں ایک جگہ آیا ہے: ((النَّظَرُ سَهْمٌ)) نظر تیر ہے۔ ’’نگاہوں کے تیر‘‘ کا ذکر شاعری اور گانوں میں تو سننے میں آتا ہے۔ پھر فرمایا کہ کسی عورت سے گفتگو کر کے چٹخارے لینا زبان کا زنا ہے۔ عورت کی آواز میں بھی لوچ ہے‘ حسن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے سراپا ایسا بنایا ہے کہ مرد کے لیے اس کی ہر شے کے اندر کشش ہے۔ اس کی آواز میں کشش ہے۔ آگے فرمایا کہ نفس تمنّا کرتا ہے کہ اب میں اس سے آگے بڑھوں اور زنا بھی کرلوں۔ لیکن اس آخری مرحلے کی نوبت آ بھی سکتی ہے اور نہیں بھی آسکتی۔ البتہ اس سے کم تر درجے کے زنا تو وہ کرچکا۔ کان کا زنا اُس نے کرلیا‘ آنکھ کا زنا اُس نے کرلیا‘ زبان کا زنا اُس نے کرلیا۔ حضور ﷺ اس سب کو زنا کی تعریف میں لائے ہیں۔ صحیح مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں:

((كُتِبَ عَلَى ابْنِ آدَمَ نَصِيبُه مِنَ الزِنا مُدْرِكُ ذٰلك لا مَحَالَةَ: العَيْنَان زِناهما النَظر، والأُذنان زِناهما الاستماع، وَاللِّسان زِناه الكلام، واليَدُ زِناها البَطْش، والرِّجلُ زِناها الخُطَا، والقلب يَهْوَى ويتمنى، ويُصَدِّقُ ذٰلك الفَرْج أو يُكَذِّبُه))

’’انسان پر اُس کے زنا وبدکاری کا حصّہ ضرور لکھا جاچکا ہے جسے وہ ضرور پانے والا ہے۔ آنکھوں کا زنا (نامحرم عورت کو بری نگاہ سے) دیکھنا ہے‘ اور کانوں کا زنا (نامحرم کی شہوت انگیز باتوں کا) سننا ہے‘ اور زبان کا زنا (شہوت انگیز) باتیں کرنا‘ اور ہاتھ کا زنا اس کا پکڑ دھکڑ کرنا (یعنی نامحرم کو بری نیت سے چھونا)‘ اور پاؤں کا زنا (بدکاری اور گناہ کے کاموں کی طرف جانا اور) چلنا ہے۔ جب کہ دل اس کی خواہش کرتا ہے اور شرم گاہ اس کی تصدیق یا تکذیب کرتی ہے۔‘‘

گویا زبان کا بھی زنا ہو رہا ہے۔ کان کا بھی ہو رہا ہے۔ ہاتھ کا بھی ہو رہا ہے۔ کہیں عورت کے جسم کو لمس کیا ہے‘ اس سے ہاتھ ملایا ہے۔ کہیں اسے دیکھنے کے لیے چل کر جارہا ہے تو یہ پاؤں کا زنا ہو رہا ہے۔ یہ ہیں زنا کی شکلیں جو محمد رسول اللہ ﷺ نے بیان کی ہیں۔

زنا کی روک تھام ہمارے اہداف کے اندر بہت زیادہ اہم ہے‘ ورنہ معاشرہ ٹوٹ

پھوٹ کا شکار ہو جائے گا۔ اگر میاں بیوی میں اعتماد نہیں ہے تو ایسی فضا میں جو اولاد پلے گی اس کی منفی نفسیات ہوں گی‘ کبھی مثبت نفسیات نہیں ہوسکتیں۔ والدین میں آپس میں محبت ہو‘ ایک دوسرے پر اعتماد ہو‘ ایک دوسرے کا لحاظ ہو‘ ایک دوسرے کی دل جوئی ہو‘ ایک دوسرے کی مدد ہو۔ یہ ساری چیزیں گھر کے اندر ایک نارمل اور صحت مند فضا پیدا کرتی ہیں کہ جس میں نئی نسل پروان چڑھے گی تو وہ ایک مثبت (positive) نفسیات کی حامل ہوگی۔ اسی طرح حضرت جابر بن عبداللہ ؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَن كان يُؤمِنُ باللّٰهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ فَلا يَخْلُوَنَّ بِامْرَأَةٍ لَيْسَ مَعَها ذُو مَحْرَمٍ مِنها، فإنَّ ثالثَهُما الشَّيطانُ)) (مسند احمد: ۱۴۶۵۱)

’’جو شخص بھی اللہ پر اور یوم آخر پر ایمان رکھتا ہو وہ کبھی کسی اجنبی عورت کے ساتھ خلوت میں ملاقات نہ کرے جس کے ساتھ اُس کا کوئی محرم نہ ہو۔‘‘

کوئی عورت کسی عالم سے مسئلہ پوچھنے کے لیے آتی ہے تو اُس کا باپ‘ بیٹا‘ بھائی یا شوہر ساتھ ہونا چاہیے۔ وہ اکیلی نہ آئے‘ اس لیے کہ ((فإنَّ ثالثَهُما الشَّيطانُ)) جہاں نامحرم عورت اور مرد ملیں گے تو تیسرا وہاں شیطان موجود ہوگا۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن عباس ؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَا يَخْلُوَنَّ رَجُلٌ بِامْرَأَةٍ إلَّا وَمعهَا ذُو مَحْرَمٍ، وَلَا تُسَافِرِ المَرْأَةُ إلَّا مع ذِي مَحْرَمٍ)) (صحيح البخاري: ۳۰۰۶، صحيح مسلم: ۱۳۴۱)

’’کوئی مرد کسی عورت کے ساتھ خلوت میں نہ ملے مگر یہ کہ اُس عورت کے ساتھ اس کا محرم موجود ہو۔ اور کوئی عورت سفر نہ کرے جب تک کہ اس کے ساتھ محرم موجود نہ ہو۔‘‘

اصلاح کے دو اصول

مختلف میدانوں میں اسلام نے جو اصلاح کی ہے اس کے دو اصول ہیں۔ ایک یہ کہ اصلاح تدریج سے ہوتی ہے‘ ایک دم نہیں۔ دوسرے اصلاح کا عمل گھر سے شروع ہونا چاہیے (charity begins at home)۔ میں اس کی مثال دے رہا ہوں۔ شراب کی حرمت تین درجوں میں ہوئی ہے۔ سورۃ البقرۃ میں فرمایا گیا:

﴿يَسۡـَٔلُوۡنَكَ عَنِ الۡخَمۡرِ وَالۡمَيۡسِرِ ؕ قُلۡ فِيۡهِمَاۤ اِثۡمٌ كَبِيۡرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۫ وَاِثۡمُهُمَاۤ اَكۡبَرُ مِنۡ نَّفۡعِهِمَا ؕ﴾ (آیت ۲۱۹)

''(اے نبی ﷺ!) یہ آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں دریافت کرتے ہیں (کہ ان کا کیا حکم ہے؟ ان سے) کہہ دیجیے کہ ان دونوں کے اندر بہت بڑے گناہ کے پہلو ہیں اور لوگوں کے لیے کچھ منفعتیں بھی ہیں' البتہ ان کا گناہ کا پہلو نفع کے پہلو سے بڑا ہے۔''

ایک اشارہ دے دیا' بات ختم۔ چنانچہ بہت سے صحابہؓ نے اسی آیت پر شراب نوشی ترک کر دی۔ معلوم ہو گیا کہ ہوا کا رخ کیا ہے' یہ کس طرف جا رہی ہے۔ پھر آگے سورۃ النساء میں آیت آئی:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَقۡرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنۡتُمۡ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعۡلَمُوۡا مَا تَقُوۡلُوۡنَ .....﴾ (آیت ۴۳)

''اے اہلِ ایمان! نماز کے قریب نہ جاؤ اس حال میں کہ تم نشے کی حالت میں ہو' یہاں تک کہ تمہیں معلوم ہو جو کچھ تم کہہ رہے ہو.....''

دیکھو اگر تم شراب کے نشے کی کیفیت میں ہو تو نماز کے قریب مت جاؤ۔ وہاں پتا نہیں تم کیا کہنا شروع کر دو۔ اب ایک اور پوائنٹ مل گیا۔ نماز جو عماد الدین ہے' اس سے روکنے والی شے تو بہت بری ہوئی۔ بہت سے لوگوں نے اس کے بعد چھوڑ دی۔ پھر اس حوالے سے حتمی آیات آئیں:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّمَا الۡخَمۡرُ وَالۡمَيۡسِرُ وَالۡاَنۡصَابُ وَالۡاَزۡلَامُ رِجۡسٌ مِّنۡ عَمَلِ الشَّيۡطٰنِ فَاجۡتَنِبُوۡهُ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ﴿۹۰﴾ اِنَّمَا يُرِيۡدُ الشَّيۡطٰنُ اَنۡ يُّوۡقِعَ بَيۡنَكُمُ الۡعَدَاوَةَ وَالۡبَغۡضَآءَ فِى الۡخَمۡرِ وَالۡمَيۡسِرِ وَيَصُدَّكُمۡ عَنۡ ذِكۡرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلۡ اَنۡتُمۡ مُّنۡتَهُوۡنَ ﴿۹۱﴾﴾ (المائدة)

''اے اہلِ ایمان! یقیناً شراب اور جوا' بت اور پانسے' یہ سب گندے کام ہیں شیطان کے عمل میں سے' تو ان سے بچ کر رہو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ شیطان تو یہ

چاہتا ہے کہ تمہارے درمیان دشمنی اور بغض پیدا کر دے شراب اور جوئے کے ذریعے سے' اور (شیطان یہ بھی چاہتا ہے کہ) تمہیں روکے اللہ کی یاد سے اور نماز سے۔ تو اب باز آتے ہو یا نہیں؟''

شیطان یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے سے تمہارے مابین دشمنی پیدا کر دے۔ شراب کے نشے میں آدمی لڑ پڑتا ہے۔ اسی طرح جوئے کے اندر بھی آدمی اگر ہارتا رہے تو آخر مار پیٹ پر اتر آتا ہے۔ تو اب باز آتے ہو یا نہیں؟ یہ بڑا دھمکی کا انداز ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہاں پر حرام کا لفظ تو نہیں آیا۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّاۤ اِلَيۡهِ رٰجِعُوۡنَ! ﴿فَهَلۡ اَنۡتُمۡ مُّنۡتَهُوۡنَ﴾ سے زیادہ روکنے کا کوئی معاملہ ہو سکتا ہے؟ حدیث کے اندر اصول آ گیا: ((مَا أَسْكَرَ كَثِيرُهُ فَقَلِيلُهُ حَرَام)) (رواه أحمد وابن ماجة) یعنی جو شے زیادہ مقدار میں ہو اور نشہ لے آئے تو اس کی تھوڑی مقدار بھی حرام ہے۔ چنانچہ شراب کا ایک قطرہ بھی حرام ہے۔ آج بعض لوگ صرف اس لیے شراب کو حرام قرار نہیں دے رہے تاکہ مغرب انہیں ماڈریٹ تسلیم کر لے۔ لبرل اور روشن خیال مان لے۔ انہیں فنڈامنٹلسٹ نہ کہے۔

اسی طریقے سے معاشرتی معاملے میں اصلاح کا جو دائرہ شروع ہوا' اس میں ابتدا میں ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن سے خطاب ہے جس سے بعض لوگوں نے یہ دلیل اخذ کی کہ یہ احکام تو صرف ازواجِ مطہراتؓ کے لیے ہیں۔ میں نے اصول پہلے بتا دیا کہ charity begins at home۔ جیسے حضور ﷺ فرماتے تھے: ((اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْن)) دیکھو' میں تمہیں اسلام کی دعوت دے رہا ہوں اور سب سے پہلا مسلمان مَیں خود ہوں۔ ((اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْن)) مَیں تمہیں ایمان کی دعوت دے رہا ہوں' اور پہلا مؤمن مَیں خود ہوں۔ جب تک انسان اپنے کردار سے بات واضح نہ کرے تو وعظ مفید اور مؤثر نہیں ہوتا۔ لہٰذا سب سے پہلے بات حضور ﷺ کی ازواجِ مطہراتؓ سے کی گئی۔

ستر و حجاب کے احکام میں تدریج

اس ضمن میں جو اصلاحی احکام آئے' ان کا تدریجی اعتبار سے آغاز سورۃ الاحزاب

سے ہوا ہے‘ جو ۵ ہجری میں نازل ہوئی۔ ان احکام کی تکمیل ہوئی ہے سورۃ النور میں جو ۶ھ میں نازل ہوئی۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے مجھے بتایا کہ ان کے استاذ حمید الدین فراہیؒ نے ایک بہت خوب صورت بات کہی: ”سورۃ الاحزاب میں گھر سے باہر کے پردے کا بیان ہے اور سورۃ النور میں گھر کے اندر کے پردے کا بیان ہے۔“ اصلاحی صاحب کہتے تھے کہ اس جملے نے میری آنکھیں کھول دیں اور قرآن مجید میرے سامنے روشن ہو گیا۔ اگر یہ بات سامنے نہ ہو تو آدمی اٹکتا ہے اور جگہ جگہ پر اشکالات پیدا ہوتے ہیں۔ سورۃ الاحزاب میں:

(۱) پہلے خطاب ازواجِ مطہراتؓ سے ہے‘ بعد میں اسے عام کر دیا گیا۔

(۲) بتایا گیا کہ عورت کا اصل کردار کیا ہے‘ اس کی اصل جگہ کیا ہے‘ یعنی گھر۔

(۳) استیذان کے حکم کا آغاز ہو گیا کہ گھروں میں اجازت لیے بغیر داخل نہ ہو۔ البتہ یہاں بھی صرف نبی ﷺ کے گھر کی بات ہوئی‘ عام نہیں۔

(۴) محرموں کی ایک چھوٹی فہرست ہے جو سورۃ الاحزاب میں آ گئی ہے۔ گھر سے باہر کے پردے کا حکم بھی آ گیا۔

اسی طرح سورۃ النور میں:

(۱) استیذان اب عام کر دیا گیا کہ کسی بھی گھر میں داخل نہ ہو جب تک اذن نہ لے لو۔ یہ تدریج ہے۔ پہلے حکم آیا کہ حضور ﷺ کے گھروں میں داخل نہ ہو‘ اب کسی بھی گھر میں داخل نہیں ہو سکتے بغیر استیذان کے۔ اس حوالے سے احادیث میں بہت سختی آئی ہے۔

(۲) گھر کے اندر محرموں سے پردہ ہے۔ محرم وہ ہے جس سے کبھی بھی‘ کسی شکل میں‘ کسی حالت میں شادی نہ ہو سکے۔ فرض کیجیے کسی آدمی کی زوجیت میں ایک بہن ہے تو اس کی دوسری بہن سے وہ شادی نہیں کر سکتا۔ البتہ اگر بیوی مر گئی تو کر سکتا ہے۔ اس لیے سالی نامحرم ہے۔ بھائی کی بیوی بھابی ہے‘ جو نامحرم ہے۔ اگر بھائی کا انتقال ہو جائے تو اس سے شادی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ جس سے شادی ہو سکتی ہے وہ محرم نہیں‘

نامحرم ہے۔ محرم صرف وہی ہے جس سے کسی حال میں شادی کا امکان نہ ہو۔ اس کی ابتدائی فہرست سورۃ الاحزاب میں ہے جبکہ تفصیلی فہرست سورۃ النور میں ہے۔

”عورت چھپا کر رکھنے کی چیز ہے“

عورتوں کے گھر کے اندر بیٹھنے سے متعلق جو بات فرمائی گئی‘ اس کے حوالے سے سنن ترمذی اور دیگر کتبِ حدیث میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے نبی اکرم ﷺ کا ارشاد نقل ہوا ہے:

((اَلْمَرْأَةُ عَوْرَةٌ، فَإِذَا خَرَجَتِ اسْتَشْرَفَهَا الشَّيْطَانُ)) (سنن الترمذی:۱۱۷۳)

”عورت تو چھپانے کی چیز ہے۔ جب یہ (گھر سے) باہر نکلتی ہے تو شیطان اس کو تاک میں رکھتا ہے۔“

”عورت چھپا کر رکھنے کی چیز ہے“ پر ہمارے ایک نوجوان ساتھی نے بڑا پیارا مضمون تحریر کیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ قرآن مجید میں جو اشارات دیے گئے ہیں ان سے بھی یہی حقیقت آشکار ہوتی ہے:

﴿حُوۡرٌ مَّقۡصُوۡرٰتٌ فِی الۡخِیَامِ ﴿۷۲﴾﴾ (الرحمٰن)

”وہ حوریں جو قیام پزیر ہیں خیموں میں۔“

جنت کی حوریں خیموں کے اندر ہوں گی‘ وہیں رہیں گی۔ قصر کہتے ہیں روک دینے کو۔ وہ اپنے خیموں سے باہر نہیں نکلتیں۔

﴿کَاَمۡثَالِ اللُّؤۡلُؤِ الۡمَکۡنُوۡنِ ﴿۲۳﴾﴾ (الواقعة)

”جیسے موتی ہوں چھپا کر رکھے گئے۔“

ایسے ہوں گی جیسے کہ موتی جنہیں چھپا کر رکھا جائے‘ اس لیے کہ عورت چھپا کر رکھنے کی شے ہے۔

متذکرہ بالا حدیث کی بعض روایات میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں:

((.....وَأَقْرَبُ مَا تَكُونُ مِن وَجْهِ رَبِّهَا وَهِيَ فِي قَعْرِ بَيْتِهَا))

''....اورعورت اپنے رب کی رضا سے سب سے زیادہ قریب اُس وقت ہوتی ہے جبکہ وہ اپنے گھر کے اندرونی حصے میں ہو۔'' (صحیح الترغیب:۳۴۶)

وہ اپنے رب کی رحمت سے قریب ترین ہوتی ہے جبکہ اپنے گھر کے بھی کسی اندرونی حصے میں ہو۔ صحن میں ہوگی تو شاید اِدھر اُدھر کے بالا خانوں سے نظر پڑ جائے۔ اسی لیے فرمایا کہ مَردوں کے لیے مسجد میں باجماعت نماز ۲۷ گنا افضل ہے جبکہ عورت کے لیے گھر کی نماز مسجد سے افضل ہے۔ مزید یہ کہ گھر کے صحن میں نماز مسجد سے افضل، دالان میں صحن سے افضل، کمرے میں دالان سے افضل، اور کمرے کی کوئی بغلی کوٹھڑی ہے تو اس میں سب سے افضل۔ امام احمد، طبرانی اور ابن حبان نے روایت کیا ہے کہ اُمّ حمید ساعدیہ ؓ نبی کریم ﷺ کے حضور حاضر ہوئیں اور عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! میرا جی چاہتا ہے کہ آپ ؐ کے ساتھ نماز پڑھوں۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

((قَدْ عَلِمْتُ، وَصَلَاتُکِ فِیْ بَیْتِکِ خَیْرٌ لَّکِ مِنْ صَلَاتِکِ فِیْ حُجْرَتِکِ، وَصَلَاتُکِ فِیْ حُجْرَتِکِ خَیْرٌ مِنْ صَلَاتِکِ فِیْ دَارِکِ، وَصَلَاتُکِ فِیْ دَارِکِ خَیْرٌ مِنْ صَلَاتِکِ فِیْ مَسْجِدِ قَوْمِکِ، وَصَلَاتُکِ فِیْ مَسْجِدِ قَوْمِکِ خَیْرٌ مِّنْ صَلَاتِکِ فِیْ مَسْجِدِ الْجُمُعَةِ))

''مجھے معلوم ہے، مگر تمہارا اپنے گھر کے ایک گوشے میں نماز پڑھنا اس سے بہتر ہے کہ تم اپنے حجرے میں نماز پڑھو، اور تمہارا اپنے حجرے میں نماز پڑھنا اس سے بہتر ہے کہ تم اپنے گھر کے دالان میں نماز پڑھو، اور تمہارا اپنے دالان میں نماز پڑھنا اس سے بہتر ہے کہ تم اپنے محلّہ کی مسجد میں نماز پڑھو، اور تمہارا اپنے محلّہ کی مسجد میں نماز پڑھنا اس سے بہتر ہے کہ تم جامع مسجد میں نماز پڑھو۔''

صحیح ابن حبان کی روایت میں الفاظ آئے ہیں: ((وَصَلَاتُكِ فِي مَسْجِدِ قَوْمِكِ خَيْرٌ مِنْ صَلَاتِكِ فِي مَسْجِدِي)) ''اور تمہارا اپنے محلّہ کی مسجد میں نماز پڑھنا اس سے بہتر ہے کہ تم میری مسجد میں نماز پڑھو۔'' چنانچہ انہوں نے اپنے گھر کے بالکل اندر ایک تاریک ترین گوشہ نماز کے لیے مخصوص کر لیا اور مرتے دم تک وہیں نماز ادا کرتی رہیں۔ نبی

اکرم ﷺ کی ان احادیث سے اسلام کا مزاج معلوم ہو رہا ہے کہ کیسی معاشرت وجود میں آ رہی ہے۔

عبداللہ بن احمد بن حنبل نے ''زوائد الزہد'' میں اور ابن ابی شیبہ اور ابن سعد نے اپنی کتابوں میں جناب مسروق ؒ سے روایت نقل کی ہے کہ اُمّ المومنین حضرت عائشہ ؓ تلاوتِ قرآن کرتے ہوئے جب اس آیت پر پہنچتی تھیں: ﴿وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ ....﴾ (الاحزاب: ۳۳) تو بے اختیار رو پڑتی تھیں۔ قرآن کہتا ہے کہ گھروں میں ٹِک کر رہو لیکن سیّدہ عائشہ ؓ نے شہادتِ عثمان ؓ کے بعد باہر نکل کر اونٹ پر سوار ہو کر لشکر کی قیادت کی اور حضرت علی ؓ سے جنگ کی۔ پھر ساری عمر افسوس رہا کہ مَیں نے غلط کام کیا۔ اس جنگ (جمل) میں ایک رات میں دس ہزار آدمی مقتول ہوئے تھے۔ جنگ میں حضرت عائشہ ؓ کے لشکر کو شکست کے بعد حضرت علی ؓ نے ان سے صرف یہ کہا کہ یہ آپ کی ذمہ داری نہیں تھی جو آپ نے خواہ مخواہ اپنے سر لے لی۔ اس کے علاوہ کوئی ملامت نہیں کی۔ اُمّ المؤمنین کو کوفہ کی چند عورتوں کے ساتھ بڑے احترام سے مدینہ پہنچا دیا گیا۔

حافظ ابوبکر بزار حضرت انس ؓ سے روایت کرتے ہیں کہ کچھ عورتوں نے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ ساری فضیلت تو مرد لوٹ کر لے گئے۔ وہ جہاد کرتے ہیں اور اللہ کی راہ میں بڑے بڑے کام کرتے ہیں۔ ہم کیا عمل کریں کہ ہمیں بھی مجاہدین کے برابر اجر مل سکے؟ جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ قَعَدَتْ مِنْكُنَّ فِي بَيْتِها فَإِنَّها تُدْرِكُ عَمَلَ الْمُجاهِدِينَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ))

''تم میں سے جو اپنے گھر میں بیٹھی رہے گی وہ اللہ کے راستے میں مجاہدین کا اجر حاصل کر لے گی۔''

یہ گویا ہوا کا رُخ بتایا جا رہا ہے۔ یہ نظامِ معاشرت ہے جو اس شکل میں دیا جا رہا ہے۔

(جاری ہے)

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُوْرَةُ الشَّمْس

تمہیدی کلمات

سورۃ الشمس اور اس کے بعد کی تین سورتوں (سورۃ اللیل‘ سورۃ الضحیٰ اور سورۃ الانشراح) کے لیے مَیں نے ”چہار سورۂ نور وظلمت“ کا مشترک عنوان تجویز کر رکھا ہے۔ ان میں سے پہلی تین سورتوں کا آغاز قسموں سے ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے سورۃ الشمس اور سورۃ اللیل (ان دونوں سورتوں کا باہم جوڑے کا تعلق بھی ہے) کا انداز سورۃ التکویر اور سورۃ الانفطار سے ملتا جلتا ہے۔ یاد رہے کہ سورۃ التکویر کے آغاز میں قسموں والا حصّہ زیادہ آیات (۱۳ آیات) پر مشتمل ہے اور جوابِ قسم کے طور پر صرف ایک آیت (آیت ۱۴) آئی ہے‘ جبکہ اس کی جڑواں سورت یعنی سورۃ الانفطار میں قسموں والا حصّہ نسبتاً کم ہے اور بعد کی آیات میں ان دونوں سورتوں کا مرکزی مضمون زیادہ کھل کر سامنے آیا ہے۔ بالکل اسی انداز میں زیر مطالعہ جوڑے کی پہلی سورت یعنی سورۃ الشمس میں قسموں والا حصّہ زیادہ (آٹھ آیات پر مشتمل) ہے اور اس کے بعد جواب القسم کے ضمن میں صرف دو آیات آئی ہیں۔ اس کے مقابلے میں سورۃ اللیل میں قسموں کا حصّہ نسبتاً کم ہے‘ جبکہ سورۃ الشمس سے شروع ہونے والا مضمون یہاں آ کر مزید واضح ہو گیا ہے۔ اس طرح یہ مضمون تدریجاً آگے بڑھتا ہوا سورۃ الضحیٰ میں جا کر نقطۂ عروج کو پہنچے گا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

وَ الشَّمْسِ وَ ضُحٰىهَا ۪ۙ﴿۱﴾ وَ الْقَمَرِ اِذَا تَلٰىهَا ۪ۙ﴿۲﴾ وَ النَّهَارِ اِذَا
جَلّٰىهَا ۪ۙ﴿۳﴾ وَ الَّيْلِ اِذَا يَغْشٰىهَا ۪ۙ﴿۴﴾ وَالسَّمَآءِ وَ مَا بَنٰىهَا ۪ۙ﴿۵﴾ وَالْاَرْضِ
وَ مَا طَحٰىهَا ۪ۙ﴿۶﴾ وَ نَفْسٍ وَّ مَا سَوّٰىهَا ۪ۙ﴿۷﴾ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ
تَقْوٰىهَا ۪ۙ﴿۸﴾ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۪ۙ﴿۹﴾ وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ؕ﴿۱۰﴾

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَاۤ ۪ۙ﴿۱۱﴾ اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰىهَا ۪ۙ﴿۱۲﴾ فَقَالَ لَهُمْ
رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَ سُقْيٰهَا ؕ﴿۱۳﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا ۪ۙ فَدَمْدَمَ
عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ۪ۙ﴿۱۴﴾ وَ لَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ۠﴿۱۵﴾

آیت ۱ ﴿وَالشَّمْسِ وَضُحٰىهَا ﴿۱﴾﴾ ”قسم ہے سورج کی اور اس کی دھوپ کی۔“

آیت ۲ ﴿وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰىهَا ﴿۲﴾﴾ ”اور قسم ہے چاند کی جبکہ وہ اس کے پیچھے آتا ہے۔“

تَلَا یَتْلُو کے معنی ہیں کسی کے پیچھے آنا۔ تلاوت کا لفظ بھی اسی مادہ سے مشتق ہے۔ لغوی معنی کے اعتبار سے لفظ ”تلاوت“ کے مفہوم میں قرآن مجید کے متن کا پڑھنا (زبان اور نظر سے عبارت کی پیروی کرنا)‘ اس کے احکام پر عمل کرنا اور اس کا اتباع کرنا شامل ہے۔

آیت ۳ ﴿وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰىهَا ﴿۳﴾﴾ ”اور قسم ہے دن کی جب وہ اس (سورج) کو روشن کر دیتا ہے۔“

اگرچہ بظاہر صورتِ حال تو یہ ہوتی ہے کہ سورج سے دن روشن ہوتا ہے‘ لیکن یہاں اسی بات کے اندر یہ لطیف نکتہ پیدا کیا گیا ہے کہ دن ہوتا ہے تو سورج نظر آتا ہے۔ گویا دن سورج کو روشن کرتا ہے۔ آیت کے اس اسلوب کا تعلق دراصل اگلی آیت کے اسلوب سے ہے۔ اگلی آیت میں رات کا ذکر بالکل اسی انداز میں ہوا ہے:

آیت ۴ ﴿وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰىهَا ﴿۴﴾﴾ ”اور قسم ہے رات کی جب وہ اس (سورج) کو ڈھانپ لیتی ہے۔“

ان دونوں آیات کا مفہوم یوں ہوگا کہ دن سورج کو نمایاں کر دیتا ہے جبکہ رات اسے ڈھانپ لیتی ہے۔

آیت ۵ ﴿وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰىهَا ﴿۵﴾﴾ ”اور قسم ہے آسمان کی اور جیسا کہ اسے بنایا۔“

آیت ۶ ﴿وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰىهَا ﴿۶﴾﴾ ”اور قسم ہے زمین کی اور جیسا کہ اسے بچھا دیا۔“

نوٹ کیجیے! یہ تمام قسمیں جوڑوں کی صورت میں آئی ہیں۔ پہلے سورج اور چاند کا‘ پھر دن اور رات کا اور اب آسمان اور زمین کا ذکر ہوا۔ ان ظاہری تضادات کی مثالوں سے دراصل نفسِ انسانی کے روشن اور تاریک پہلوؤں کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ جس طرح کائنات میں ہر جگہ تم لوگوں کو تضادات نظر آتے ہیں‘ سورج ہے تو اس کے ساتھ چاند ہے‘ اندھیرا ہے تو اس کے ساتھ

اُجالا ہے‘ بلندی ہے تو اس کے ساتھ پستی ہے‘ اسی طرح انسان کی ذات یا شخصیت کے بھی دو رُخ ہیں۔ بظاہر دیکھنے میں تو تمام انسان ایک جیسے نظر آتے ہیں‘ لیکن حقیقت میں یہ ایک جیسے نہیں ہیں۔ ان میں سے کوئی حیوانی اور نفسانی خواہشات کے راستے پر چل رہا ہے تو کسی نے اپنے نفس کا تزکیہ کر کے فلاح کی منزل حاصل کر لی ہے۔

آیت ۷ ﴿وَنَفۡسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝۷﴾ ”اور قسم ہے نفسِ انسانی کی اور جیسا کہ اُس کو سنوارا۔“

آیت ۸ ﴿فَاَلۡهَمَهَا فُجُوۡرَهَا وَتَقۡوٰىهَا ۝۸﴾ ”پس اُس کے اندر نیکی اور بدی کا علم الہام کر دیا۔“

اب اگلی دو آیات میں ان قسموں کے جواب مذکور ہے۔

آیت ۹ ﴿قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَكّٰىهَا ۝۹﴾ ”یقیناً کامیاب ہو گیا جس نے اس (نفس) کو پاک کر لیا۔“

آیت ۱۰ ﴿وَقَدۡ خَابَ مَنۡ دَسّٰىهَا ۝۱۰﴾ ”اور ناکام ہو گیا جس نے اسے مٹی میں دفن کر دیا۔“

یہ اس سورت کا مرکزی مضمون ہے۔ ان دو آیات میں انتہائی اختصار کے ساتھ انسان کی حقیقی کامیابی اور ناکامی کا معیار بیان کر دیا گیا ہے۔ دَسَّ یَدُسُّ کے معنی کسی چیز کو مٹی میں دفن کر دینے کے ہیں۔ سورۃ النحل (آیت ۵۹) میں ہم پڑھ چکے ہیں: ﴿اَیُمۡسِكُهٗ عَلٰی هُوۡنٍ اَمۡ یَدُسُّهٗ فِی التُّرَابِ ؕ﴾ اس آیت میں قبل از اسلام زمانے کے عربوں کی ایک خاص ذہنیت کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ ان میں سے جس شخص کے گھر بیٹی پیدا ہوتی ہے وہ یا تو اسے ذِلّت آمیز طریقے سے زندہ رکھتا ہے یا زندہ دفن کر دیتا ہے۔ یہاں ”دَسّٰی“ دراصل دَسَّسَ (باب تفعیل) ہے‘ اس کے آخری سین کو یا سے بدل دیا گیا ہے۔ تو جس انسان نے اپنے نفس کو مٹی میں دفن کر دیا (اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ جس نے اپنی روح کو اپنے خاکی وجود کے اندر دبا دیا۔ یعنی جس کی حیوانی خواہشات وشہوات اس کی روح پر غالب آ گئیں) تو وہ ناکام رہا۔ البتہ جیسا کہ سورۃ الاعلیٰ کے مطالعہ کے دوران بھی نشان دہی کی گئی ہے‘ زیر مطالعہ سورتوں کے مضامین میں سے اکثر کا تعلق سورۃ الاعلیٰ کے مضامین کے ساتھ ہے۔ چنانچہ سورۃ الاعلیٰ میں ﴿قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ تَزَكّٰی ۝۱۴﴾ کے

الفاظ میں جو مضمون انتہائی مختصر انداز میں آیا تھا‘ یوں سمجھیں کہ اب آیات زیر مطالعہ میں اس مضمون کی مزید تفصیل بیان ہوئی ہے۔ اس مضمون پر قسموں کی صورت میں یہاں مزید گواہیاں بھی لائی گئی ہیں اور زیر مطالعہ آیت کے الفاظ ﴿وَقَدۡ خَابَ مَنۡ دَسّٰىهَا ۝۱۰﴾ میں تصویر کا دوسرا رخ بھی دکھایا گیا ہے۔

دراصل انسان کا نفس اس کے پاس اللہ تعالیٰ کی امانت ہے۔ اس امانت کو پاک صاف رکھنا اس کی ذِمّہ داری ہے۔ نفس کو پاک کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو‘ یعنی اپنی شخصیت کو تمام رذائل اور باطنی بیماریوں سے پاک کر کے بہترین انسانی خوبیوں کا مرقع بنائے۔ اس کے لیے ہمارے ہاں عام طور پر تزکیۂ نفس‘ تعمیرِ سیرت‘ تعمیرِ خودی وغیرہ اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں۔ بہرحال اللہ تعالیٰ کی نظر میں کامیاب انسان وہی ہے جو اپنے نفس کو پاک کرنے اور پاک رکھنے میں کامیاب ہو گیا‘ خواہ دنیا والوں کی نظروں میں وہ حقیر‘ فقیر اور بے نام ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے برعکس جس انسان نے اپنے نفس کو رذائل و خبائث سے آلودہ کر لیا‘ اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ ناکام ہے‘ دنیا میں خواہ وہ غیر معمولی عزّت‘ شہرت اور دولت کا مالک ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے کہ اصل اور حقیقی کامیابی اور ناکامی کا تعلق انسان کے ظاہر سے نہیں بلکہ اُس کی ”ذات“ سے ہے۔

انسان کی ”ذات“ سے کیا مراد ہے؟ فرائڈ نے اسے انسان کی self (اَنا) کا نام دیا ہے۔ اس کے نزدیک انسان کی اصل کامیابی یہ ہے کہ وہ اپنی self کو id اور libido کے تسلّط سے آزاد کرا کے اسے مثبت انداز میں ترقّی دے۔ علّامہ اقبال نے اسے خودی کا نام دیا ہے اور انسان کی ”کامیابی“ کو اس کی خودی کی تعمیر وترقی سے مشروط کیا ہے۔ بہرحال اس حوالے سے سمجھنے کا اصل نکتہ یہ ہے کہ انسان محض ایک جسم یا ہاتھ پاؤں‘ سر‘ دھڑ وغیرہ کے مجموعے کا نام نہیں ہے۔ انسان کہتا ہے میرا ہاتھ‘ میرا پاؤں‘ میرا سر وغیرہ۔ یہ تمام اعضاء بے شک اُس کے ہیں‘ لیکن وہ انسان جو ان اعضاء کو اپنا بتا رہا ہے وہ خود کیا ہے؟ اور کہاں ہے؟ ظاہر ہے اصل انسان اُس جسم یا وجود کے اندر ہے۔ اس کو ایسے سمجھیں کہ جس طرح آم کی گٹھلی کے اندر آم کا پورا درخت موجود ہے‘ اسی طرح انسانی جسم کے اندر اصل انسان ایک لطیف شخصیت کی صورت میں موجود ہے۔ یہ لطیف شخصیت عبارت ہے اس روح سے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے حیوانی یا خاکی وجود کے اندر پھونکی ہے: ﴿وَنَفَخۡتُ فِیۡهِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ﴾ (الحجر: ۲۹)۔ روح یا انسان کی انا کا ذکر اپنشد کے

اس فقرے میں بھی ہے، جس کا حوالہ مَیں پہلے بھی دے چکا ہوں:

Man in his ignorance identifies himself with the material sheeths that encompass his real self.

گویا انسان کی self یا انا یا خودی یا روح اُس کے حیوانی وجود کی مٹّی کے اندر دفن ایک خزانہ ہے۔ اب جو انسان اس خزانے کو مٹّی سے نکال کر کام میں لے آئے گا، یعنی اپنی روح کو صیقل کرلے گا، اُس کا نفس پاک ہو جائے گا (روح کی پاکیزگی نفس کی پاکیزگی کا باعث بنتی ہے۔ دونوں کا تعلق انسان کے باطن سے ہے) اور وہ کامیابی یا فلاح کے راستے پر گامزن ہوجائے گا۔ (فلاح کا لفظ قرآن مجید میں ایک جامع اصطلاح کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ اس اصطلاح کے مفہوم کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ المؤمنون کی پہلی آیت کی تشریح۔)

زیر مطالعہ آیات کے حوالے سے یہ نکتہ خصوصی طور پر پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ انسان کی روح اور اس کا نفس دو الگ الگ چیزیں ہیں اور ان آیات میں انسانی روح کا نہیں بلکہ انسانی نفس کا ذکر ہوا ہے۔ روحِ انسانی دراصل عالمِ امر کی چیز ہے اور یہ معرفتِ خداوندی اور محبّتِ خداوندی کی امین ہے، جبکہ نفسِ انسانی کا تعلق عالمِ خلق سے ہے۔ اسی لیے اس کے ذکر سے پہلے جن چیزوں کی یہاں قسمیں کھائی گئی ہیں ان سب (سورج، چاند، دن، رات، آسمان، زمین) کا تعلق بھی عالمِ خلق سے ہے۔ روح تمام مخلوقات میں سے صرف انسان کو عطا ہوئی ہے، جبکہ نفس گدھے، گھوڑے اور چمپینزی وغیرہ سب جانوروں میں ہوتا ہے۔ البتہ انسان کی خصوصیت اس حوالے سے یہ ہے کہ دوسرے جانوروں کے مقابلے میں نفسِ انسانی کو اللہ تعالیٰ نے خصوصی ارتقائی درجات سے نوازا ہے اور اس کے اندر اخلاقی حس اور نیکی و بدی کی وہ تمیز الہام کر دی ہے جو دوسرے جانوروں کے نفس میں نہیں پائی جاتی۔ اسی حس اور تمیز کی وجہ سے انسانی فطرت آفاقی سطح پر نیکی کو اچھا اور بدی کو برا سمجھتی ہے۔ دنیا میں کسی معاشرے، کسی مذہب اور کسی نسل کا انسان ہو وہ سچ بولنے کو اچھا اور جھوٹ بولنے کو برا سمجھتا ہے۔ اس حوالے سے قرآن میں معروف اور منکر کی اصطلاحات کثرت سے استعمال ہوتی ہیں۔ معروف وہ چیزیں یا افعال یا اعمال ہیں جو نفس انسانی کے لیے مانوس ہیں۔ انہیں دیکھ کر یا اپنا کر نفسِ انسانی کو راحت محسوس ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں منکرات وہ چیزیں یا اعمال یا افعال ہیں جنہیں نفسِ انسانی بُرا سمجھتا ہے اور جن کی صحبت و معیت میں وہ اجنبیت اور کوفت محسوس کرتا ہے، بلکہ وہ انسان کو ایسے اعمال وافعال سے ٹوکتا ہے۔

اسی لیے انسان غلطی کرنے کے بعد اکثر یہ کہتا پایا جاتا ہے کہ ''میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا ہے'' (my conscience is pinching me)۔ نفسِ انسانی کی اسی خصوصیت کی وجہ سے سورۃ القیامہ کی آیت ۲ میں اسے نفسِ لوامہ (ملامت کرنے والا نفس) کا نام دیا گیا ہے۔

اس حوالے سے آیات زیر مطالعہ کا بنیادی پیغام یہ ہے کہ نفسِ انسانی کے اندر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نیکی اور بدی کی تمیز کا بنیادی بیج ڈال دیا گیا ہے۔ اب انسان کا کام یہ ہے کہ وہ اس بیج کی حفاظت کرے، اسے سازگار ماحول فراہم کرے اور عملِ صالح کے پانی سے اس کی آبیاری کرے۔ سورۃ فاطر (آیت ۱۰) میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿اِلَیۡہِ یَصۡعَدُ الۡکَلِمُ الطَّیِّبُ وَالۡعَمَلُ الصَّالِحُ یَرۡفَعُہٗ ؕ﴾ کہ کسی بھی اچھی بات یا اچھے کلام میں اللہ تعالیٰ کے حضور پہنچنے کی صلاحیت تو ہوتی ہے لیکن عمل صالح اُس کی اس صلاحیت کو اور بڑھا دیتا ہے۔ چنانچہ انسان جب تزکیۂ نفس اور اعمالِ صالحہ کے حوالے سے محنت کرے گا تو اُسے ایمان کی حلاوت بھی نصیب ہوگی، وہ ایمان کے ان ثمرات سے بھی بہرہ مند ہوگا جن کا ذکر ہم سورۃ التغابن میں پڑھ آئے ہیں اور اسے کامیابی کی ضمانت بھی ملے گی۔ اس کے برعکس جس انسان نے اپنے نفس کو حیوانی وجود کے تابع کیے رکھا اور وہ اس کی آواز کو دبا کر زندگی بھر جسمانی تقاضے پورے کرنے میں لگا رہا وہ گویا خائب و خاسر ہو کر رہ گیا۔

اب اگلی آیات میں ایک قوم یا ایک معاشرے کے اجتماعی ضمیر کے حوالے سے ایک مثال دی گئی ہے۔ ظاہر ہے جس طرح ایک انسان کے اندر نیکی اور بدی کی تمیز ہوتی ہے اسی طرح ہر معاشرے میں اجتماعی طور پر بھی اخلاقی حس پائی جاتی ہے، اور جس طرح ایک انسان میں اچھے برے داعیات ہوتے ہیں اسی طرح ہر معاشرے کے اندر بھی نیکی کے علمبردار اور شر پھیلانے والے عناصر موجود ہوتے ہیں۔ غرض جس طرح ایک فرد کا ضمیر ہوتا ہے اسی طرح معاشروں اور قوموں کا اجتماعی ضمیر بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر کسی قوم کا اجتماعی ضمیر زندہ ہو، اس کی صفوں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ احسن طریقہ سے ادا کیا جا رہا ہو تو اس قوم کے مجموعی حالات بہتر طور پر چلتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر کسی قوم کا اجتماعی ضمیر مردہ ہو جائے اور اس کی اخلاقی حس بحیثیت مجموعی اس قدر کمزور ہو جائے کہ اس کے ماحول میں برائی کو برائی کہنے والا بھی کوئی نہ رہے تو ایسی قوم اپنے زندہ رہنے کا جواز کھو دیتی ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں اسی اجتماعی بے حسی کی تصویر پیش کی ہے: ؎

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا!

اس حوالے سے اب ملاحظہ ہو قومِ ثمود کی مثال:

آیت ۱۱ ﴿كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَآ ۝۱۱﴾ ''قومِ ثمود نے بھی جھٹلایا تھا اپنی سرکشی کے باعث۔''

یعنی حضرت صالح علیہ السلام کی نبوت کو جھٹلا دیا جو اُن کی ہدایت کے لیے مبعوث کیے گئے تھے۔

آیت ۱۲ ﴿اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰىهَا ۝۱۲﴾ ''جب اُٹھ کھڑا ہوا ان کا سب سے شقی انسان۔''

وہ شخص اپنی قوم کے لوگوں کے کہنے پر اس اونٹنی کو ہلاک کرنے پر کمر بستہ ہو گیا جسے اللہ تعالیٰ نے اس قوم کے مطالبے پر بطورِ معجزہ پیدا کیا تھا۔

آیت ۱۳ ﴿فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا ۝۱۳﴾ ''تو اللہ کے رسولؑ نے اُن سے کہا کہ (خبردار!) یہ اللہ کی اونٹنی ہے اور یہ اس کے پانی پینے کا دن ہے۔''

آیت ۱۴ ﴿فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا ۝﴾ ''تو انہوں نے اُس کو جھٹلا دیا اور اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں۔''

﴿فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ۝۱۴﴾ ''تو اُلٹ دیا اُن پر عذاب اُن کے ربّ نے اُن کے گناہ کی پاداش میں اور سب کو برابر کر دیا۔''

ان کے جرمِ عظیم کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے ان پر عذابِ استیصال نازل فرمایا اور پوری قوم کو ایک ساتھ پیوندِ خاک کر دیا۔

آیت ۱۵ ﴿وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ۝۱۵﴾ ''اور وہ اس کے انجام سے نہیں ڈرتا۔''

اللہ تعالیٰ کو اپنے اس فعل کے کسی برے نتیجے کا کوئی خوف نہیں ہے کہ اس کے بعد کیا ہوگا؟ وہ پوری کائنات کا مالک اور خالق ہے‘ وہ جو چاہے کرے۔ اُس نے اس پوری قوم کو ختم کر دیا اور ان کی جگہ دوسری قوم کو لے آیا۔ اس سورت میں پہلے انسانی نفس اور ضمیر کے حوالے سے انسان کی انفرادی کامیابی اور ناکامی کا ذکر ہوا اور پھر قومِ ثمود کی مثال دے کر قوموں کی اجتماعی کامیابی اور ناکامی کے معیار کے بارے میں بھی بتا دیا گیا۔ اس سورت کے مضمون کا تسلسل اگلی سورت میں بھی نظر آئے گا۔ ❁❁❁

سُوْرَةُ الَّيْلِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى ۝۱ وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى ۝۲ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ
وَالْاُنْثٰٓى ۝۳ اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى ۝۴ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝۵ وَ
صَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝۶ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝۷ وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ
وَاسْتَغْنٰى ۝۸ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۝۹ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ۝۱۰ وَمَا
يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗٓ اِذَا تَرَدّٰى ۝۱۱ اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ۝۱۲ وَاِنَّ لَنَا
لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى ۝۱۳ فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى ۝۱۴ لَا يَصْلٰىهَآ اِلَّا
الْاَشْقَى ۝۱۵ الَّذِيْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۝۱۶ وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ۝۱۷ الَّذِيْ
يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۝۱۸ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ۝۱۹
اِلَّا ابْتِغَاۗءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۝۲۰ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ۝۲۱

آیت ۱ ﴿وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى ۝۱﴾ ''قسم ہے رات کی جب وہ ڈھانپ لیتی ہے۔''

یعنی تمام چیزوں پر تاریکی کا پردہ ڈال دیتی ہے۔

آیت ۲ ﴿وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى ۝۲﴾ ''اور قسم ہے دن کی جب وہ روشن ہو جاتا ہے۔''

رات اور دن اللہ تعالیٰ کی آفاقی نشانیوں میں سے ہیں‘ جبکہ اگلی قسم کا تعلق انسان کی ذات (اللہ تعالیٰ کی انفسی نشانیوں) سے ہے۔

آیت ۳ ﴿وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰٓى ۝۳﴾ ''اور (قسم ہے) اُس کی جو اُس نے پیدا کیے نر اور مادہ۔''

ان قسموں سے یہ نکتہ واضح ہوتا ہے کہ کائنات کے اندر نظر آنے والے تضادات دراصل نظامِ کائنات کا حصّہ ہیں‘ بلکہ کائنات کا نظام انہی تضادات کی وجہ سے چل رہا ہے اور ایک جنس

سے تعلق رکھنے والی دو متضاد چیزیں باہم مل کر فطرت کے تقاضوں کی تکمیل کرتی ہیں۔ دنیا کا سارا نظام دن اور رات کے ادلنے بدلنے کی وجہ سے قائم ہے۔ زمین پر حیوانی اور نباتاتی زندگی کا وجود اسی گردشِ لیل ونہار کا مرہونِ منت ہے۔ خود نسلِ انسانی کا تسلسل بھی مرد اور عورت کے جنسی اختلاف وتضاد کی وجہ سے چل رہا ہے۔ چنانچہ کائنات کی مختلف تخلیقات میں بظاہر نظر آنے والے ان تضادات کے اندر بھی ایک طرح کا توافق اور تطابق پایا جاتا ہے۔

آیت ۴ ﴿اِنَّ سَعۡیَکُمۡ لَشَتّٰی ؕ﴿۴﴾﴾ ’’بے شک تمہاری کوشش الگ الگ ہے۔‘‘

یعنی جس طرح کائنات کی باقی چیزوں میں اختلاف وتضاد پایا جاتا ہے اسی طرح تمہارے مختلف افراد کی کوششوں اور محنتوں کی نوعیت بھی مختلف ہے۔

ظاہر ہے زندگی کے شب وروز میں محنت‘ مشقت اور بھاگ دوڑ کرنا تو انسان کا مقدر ہے: ﴿لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡ کَبَدٍ ؕ﴿۴﴾﴾ (البلد) ’’بے شک ہم نے انسان کو پیدا ہی محنت اور مشقت میں کیا ہے‘‘۔ ہر انسان اپنا اور اپنے اہل وعیال کا پیٹ پالنے کے لیے بھی مشقت کرتا ہے۔ پھر اگر وہ کسی نظریے کا پیروکار ہے تو اس نظریے کی اشاعت اور سربلندی کے لیے بھی تگ ودو کرتا ہے اور اس نظریے کے تحت ایک نظام کے قیام کے لیے بھی جدّوجہد کرتا ہے۔ غرض اپنے اپنے ماحول اور حالات کے مطابق محنت اور مشقت تو سب انسان ہی کرتے ہیں لیکن ان کی مشقتوں کے نتائج مختلف ہوتے ہیں۔ ایک شخص اپنی محنت کے نتیجے میں جنّت خرید لیتا ہے اور دوسرا اپنی محنت ومشقت کی پاداش میں خود کو دوزخ کا مستحق بنا لیتا ہے۔ انسانی محنت میں اس فرق کی وضاحت حضورﷺ کی اس حدیث میں ملتی ہے۔ حضورﷺ نے فرمایا: ((کُلُّ النَّاسِ یَغْدُوْ فَبَائِعٌ نَفْسَهٗ فَمُعْتِقُهَا اَوْ مُوْبِقُهَا))(۱) ’’ہر شخص روزانہ اس حال میں صبح کرتا ہے کہ اپنی جان کا سودا کرتا ہے‘ پھر یا تو وہ اسے آزاد کرا لیتا ہے یا اسے تباہ کر بیٹھتا ہے‘‘۔ کوئی اپنی جسمانی قوت کا سودا کرتا ہے‘ کوئی ذہنی صلاحیت بیچتا ہے‘ کوئی اپنی مہارت نیلام کرتا ہے‘ کوئی اپنا وقت فروخت کرتا ہے۔ غرض اپنے اپنے طریقے اور اپنے اپنے انداز میں ہر شخص دن بھر خود کو بیچتا ہے۔ اب ان میں سے ایک شخص وہ ہے جس نے خود کو بیچتے ہوئے حلال کو مدّنظر رکھا‘ اُس نے جھوٹ نہیں بولا‘ کسی کو دھوکہ نہیں دیا‘ کم معاوضہ قبول کر لیا لیکن حرام سے اجتناب کیا۔ ایسا شخص

۱۔ صحیح مسلم‘ کتاب الطھارۃ‘ باب فضل الوضوء۔

شام کو لوٹے گا تو اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کے شاملِ حال ہو گی۔ اس کے مقابلے میں ایک دوسرے شخص نے بھی دن بھر مشقت کی‘ مگر حلال وحرام کی تمیز سے بے نیاز ہو کر‘ معاوضہ اُس نے بھی لیا مگر غلط بیانی کر کے اور دوسروں کو فریب دے کر‘ ناپ تول میں کمی کر کے اور گھٹیا چیز کو بڑھیا چیز کے دام پر بیچ کر۔ اب یہ شخص جب شام کو گھر آئے گا تو جہنّم کے انگاروں کی گٹھڑی اُٹھائے ہوئے آئے گا۔

اب آئندہ آیات میں انسانی زندگی کے دو راستوں میں سے ہر راستے کے تین اوصاف یا تین سنگ ہائے میل کی نشاندہی کر دی گئی ہے‘ تاکہ ہر شخص کو معلوم ہو جائے کہ اس نے کون سا راستہ اختیار کیا ہے‘ اس راستے پر اب وہ کس مقام پر ہے اور اگر وہ مزید آگے بڑھے گا تو آگے کون سی منزل اس کی منتظر ہو گی۔ اس مضمون کے اعتبار سے مَیں سمجھتا ہوں کہ یہ قرآن مجید کی اہم ترین سورت ہے۔ اب ملاحظہ ہوں ان میں سے پہلے راستے کے تین اوصاف:

آیت ۵ ﴿فَاَمَّا مَنۡ اَعۡطٰی وَ اتَّقٰی ۙ﴿۵﴾﴾ ’’تو جس نے عطا کیا اور تقویٰ اختیار کیا۔‘‘

ظاہر ہے یہ خیر کا راستہ ہے اور اس راستے کا پہلا وصف یا پہلا سنگ میل ’’اِعطاء‘‘ یا انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ سورۃ البلد میں اس عمل کو انسان کے لیے ایک بہت مشکل گھاٹی قرار دے کر اس کی وضاحت یوں فرمائی گئی: ﴿فَکُّ رَقَبَۃٍ ﴿ۙ۱۳﴾ اَوۡ اِطۡعٰمٌ فِیۡ یَوۡمٍ ذِیۡ مَسۡغَبَۃٍ ﴿ۙ۱۴﴾ یَّتِیۡمًا ذَا مَقۡرَبَۃٍ ﴿ۙ۱۵﴾ اَوۡ مِسۡکِیۡنًا ذَا مَتۡرَبَۃٍ ﴿ؕ۱۶﴾ ثُمَّ کَانَ مِنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا...﴾ ’’کسی گردن کا چھڑا دینا۔ یا کھانا کھلا دینا بھوک کے دن‘ اُس یتیم کو کہ جو قرابت دار بھی ہے‘ یا اُس محتاج کو جو مٹی میں رُل رہا ہے۔ پھر وہ شامل ہوا ان لوگوں میں جو ایمان لائے......‘‘

یعنی جو انسان اس ’’مشکل گھاٹی‘‘ کو عبور کرنے کے بعد اہلِ ایمان کی صف میں شامل ہو گا وہ ان شاء اللہ ابوبکر صدیق‘ عمر فاروق‘ عثمان غنی اور علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہم کا پیروکار بنے گا۔ لیکن جس نے یہ امتحان پاس کیے بغیر ہی کلمہ پڑھ لیا تو اس کے بارے میں خدشہ ہے کہ توحید ورسالت کی گواہی دینے کے بعد بھی اس کے ایمان کی بُو باس عبداللہ بن اُبی کے ایمان کی سی ہو گی۔ ظاہر ہے جو کلمہ حضرت ابوبکر‘ حضرت عمر‘ حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم نے پڑھا تھا وہی کلمہ عبداللہ بن اُبی نے بھی پڑھا تھا۔ یعنی ایمان کا بیج تو دونوں طرف ایک سا تھا‘ مگر یہ زمین اور تھی‘ وہ زمین اور تھی۔ اس زمین میں انفاق فی سبیل اللہ کا ہل چل چکا تھا اور اُس زمین میں حُبِّ دنیا اور شکوک وتردّد کے جھاڑ

جھنکاڑ نے قبضہ جما رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ عبداللہ بن اُبی کے دل کی زمین میں ایمان کے بیج کا جماؤ ممکن ہی نہ ہوا۔ اس حوالے سے اگر سورۂ آل عمران کی آیت ۹۲ کے اس جملے کو مدِّنظر رکھا جائے تو انفاق و اعطاء کے اس فلسفے کو سمجھنا بہت آسان ہو جاتا ہے: ﴿لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ ؕ﴾ یعنی جب تک تم لوگ اپنی عزیز ترین چیز کو اللہ کی راہ میں نہ دے ڈالو تم نیکی کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا چاہیے تو مال کی قربانی دو اور قربانی بھی بہترین چیز کی۔ یہ نہیں کہ چھانٹ کر بے کار چیزیں کسی کو دے کر سمجھو کہ تم نے حاتم طائی کی قبر پر لات ماردی ہے۔

اس راستے کا دوسرا وصف یا سنگِ میل تقویٰ (وَاتَّقٰی) ہے۔ یعنی انسان کا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے ڈرتے رہنا۔ ہر لحہ برائی کی خاردار جھاڑیوں سے اپنا دامن بچانے کی فکر میں رہنا اور مسلسل کوشش کرتے رہنا کہ مَیں کسی کا دل نہ دکھاؤں اور کسی کا حق نہ ماروں۔ لیکن یہ تبھی ممکن ہے جب انسان کے اندر اللہ تعالیٰ کی ودیعت کردہ وہ اخلاقی حس زندہ و بیدار ہو جس کا ذکر سورۃ الشّمس کی آیت ﴿فَاَلۡہَمَہَا فُجُوۡرَہَا وَتَقۡوٰىہَا ﴿۸﴾﴾ میں آیا ہے۔ اگر اس کی اخلاقی حس کی شمع ہوا و ہوس کے طوفان کی نذر ہو چکی ہو تو پھر ظاہر ہے کہاں کا تقویٰ اور کس کا ڈر!

آیت ۶ ﴿وَصَدَّقَ بِالۡحُسۡنٰی ﴿۶﴾﴾ ''اور اُس نے تصدیق کی اچھی بات کی۔''

یہ خیر کے راستے کی تیسری شرط یا اس کا تیسرا وصف ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ جب بھلائی اور حق کی کوئی بات انسان کے سامنے آئے اور اس کا دل گواہی دے دے کہ ہاں یہ بات حق ہے تو وہ بلاتردّد اس کی تصدیق کر دے۔ یعنی وہ بھلائی‘ سچائی اور حق کی تصدیق کرنے کے لیے عواقب و نتائج کی پروا نہ کرے۔ حق کو حق جان کر اس کی تصدیق و توثیق کے لیے سود و زیاں کا ترازو نصب کر کے نہ بیٹھ جائے اور نہ ہی اس حوالے سے اپنی انا کو آڑے آنے دے۔ جیسے کہ ہماری روزمرہ کی زندگی میں اکثر ہوتا ہے کہ دو آدمیوں کی بحث کے دوران ایک آدمی پر واضح ہو جاتا ہے کہ دوسرے کی بات درست ہے مگر وہ صرف اپنی انا کی وجہ سے اس کے موقف کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

آیت ۷ ﴿فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلۡیُسۡرٰی ﴿۷﴾﴾ ''تو اُس کو ہم رفتہ رفتہ آسان منزل (جنّت) تک پہنچا دیں گے۔''

اس حوالے سے سورۃ الاعلیٰ کی یہ آیت بھی ذہن میں تازہ کر لیجیے: ﴿وَنُیَسِّرُکَ

لِلۡیُسۡرٰی ﴿۸﴾﴾ ''اور ہم رفتہ رفتہ پہنچائیں گے آپ کو آسان منزل تک''۔ لیکن سورۃ الاعلیٰ کی نسبت یہاں یہ مضمون زیادہ واضح انداز میں آیا ہے۔ اب اس کے مقابلے میں اگلی آیات میں دوسرے راستے اور اس کے تین سنگ ہائے میل کا ذکر آ رہا ہے:

آیت ۸ ﴿وَاَمَّا مَنۡۢ بَخِلَ﴾ ''اور جس نے بخل کیا''

پہلی تین خصوصیات کی ترتیب ذہن میں رکھیے اور نوٹ کیجیے کہ ''اِعطاء'' کے مقابلے میں یہاں بخل آ گیا ہے۔

﴿وَاسۡتَغۡنٰی ﴿۸﴾﴾ ''اور بے پروائی اختیار کی۔''

بھلائی اور خیر کے راستے کی تین خصوصیات میں اعطاء کے بعد تقویٰ یعنی پھونک پھونک کر قدم رکھنے اور ذمہ داری کے احساس کا بیان تھا۔ اس کے مقابلے یہاں لااُبالی پن‘ لاپرواہی اور بے نیازی (استغناء) کا تذکرہ ہے۔ گویا ایک شخص حلال و حرام کی تمیز سے ناآشنا اور نیکی و بدی کے تصوّر سے بیگانہ اپنی دُھن میں مست چلا جارہا ہے۔ کسی کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے تو اس کی بلا سے‘ کسی کی عزّت پر حرف آتا ہے تو آتا رہے‘ کسی کے جان و مال کی حرمت پامال ہوتی ہے تو بھی پروا نہیں! غرض اپنی سوچ ہے‘ اپنی مرضی ہے اور اپنے کام سے کام ہے: ؎

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے!

آیت ۹ ﴿وَکَذَّبَ بِالۡحُسۡنٰی ﴿۹﴾﴾ ''اور جھٹلادیا اچھی بات کو۔''

یعنی اُس کے دل نے گواہی دے دی کہ یہ سچ اور حق بات ہے لیکن اس کے باوجود اس نے تعصب یا تکبّر یا ہٹ دھرمی یا مفاد یا کسی خوف کی وجہ سے اسے جھٹلا دیا۔ واضح رہے اس آیت کا تقابل آیت ۶ (وَصَدَّقَ بِالۡحُسۡنٰی ﴿۶﴾) کے ساتھ ہے۔

آیت ۱۰ ﴿فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلۡعُسۡرٰی ﴿۱۰﴾﴾ ''تو اُس کو ہم رفتہ رفتہ مشکل منزل (جہنّم) تک پہنچا دیں گے۔''

یہ ہیں انسانی کوشش اور مشقّت کے دو رخ۔ گویا پہلی تین شرائط کو اپنانے کا راستہ صدیقین اور شہداء کا راستہ ہے۔ اگر کسی نے کوشش کی لیکن وہ مذکورہ تینوں شرائط کو کماحقّہ پورا نہ کر سکا تو اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی کوشش اور اخلاص کے مطابق ہوگا۔ لیکن جس بدقسمت شخص کی

کوشش اور محنت میں ان تینوں اوصاف کا فقدان ہوا اور وہ ان کے مقابلے میں عمر بھر دوسرے راستے (بخل‘ استغناء اور تکذیب) پر گامزن رہا‘ ظاہر ہے اس کا شمار ان بدترین لوگوں کے گروہ میں ہوگا جس کے سرغنہ ابولہب اور ابوجہل ہیں۔

یہاں ضمنی طور پر یہ بھی جان لیجیے کہ ابوجہل کے مقابلے میں ابولہب کا کردار کہیں زیادہ گھٹیا اور مذموم تھا‘ بلکہ قرآن مجید نے جس انداز میں اس کی مذمت کی ہے اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنے گروہ کا بدترین فرد تھا۔ بزدلی‘ بخیلی اور حد سے بڑھی ہوئی خودغرضی اس کے کردار کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ اُس کے بخل اور مال کو سینت سینت کر رکھنے کا ذکر سورۃ اللھب میں بھی آیا ہے۔ اس کی بزدلی اور خودغرضی کا پول اُس وقت کھلا جب اس کے سامنے اپنے ’’دین‘‘ کے لیے جنگ کرنے کا مرحلہ آیا‘ اُس وقت اس نے اپنی جگہ کرائے کے دو سپاہیوں کو لڑنے کے لیے بھیج دیا۔ اس کے مقابلے میں ابوجہل صاف گو‘ بہادر اور اپنے نظریے پر مر مٹنے والا شخص تھا۔ چنانچہ اُس نے اپنے باطل دین کی خاطر بڑے فخر سے گردن کٹوائی۔ انگریزی کی مثل ہے: "give the devil his due" یعنی شیطان کے کردار میں بھی اگر کوئی مثبت خصوصیت ہو تو اس کے اعتراف میں کوئی حرج نہیں۔ ظاہر ہے اس کی شخصیت میں آخر کوئی تو خوبی تھی جس کی بنا پر حضورﷺ نے اپنی خصوصی دعا میں اُسے اور حضرت عمرؓ کو ایک ہی پلڑے میں رکھا تھا۔ حضورﷺ نے تو ان دونوں شخصیات کے لیے برابر کی دعا کی تھی کہ اے اللہ! عمر بن الخطاب اور عمرو بن ہشام میں سے کسی ایک کو میری جھولی میں ڈال دے! حضورﷺ کی اس دعا کی روشنی میں تو یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اگر ابوجہل ایمان لے آتا تو وہ حضرت عمرؓ کے پائے کا مسلمان ہوتا‘ نہ کہ عبداللہ بن اُبی کے کردار والا مسلمان۔

بہرحال ان آیات میں انسان کی کامیابی اور ناکامی کے معیار اور اوصاف کی واضح طور پر نشاندہی کر دی گئی ہے۔ جو انسان اپنی سیرت و شخصیت کی بنیاد پہلے تین اوصاف (بحوالہ آیت ۵ اور ۶) پر رکھے گا وہ‘ ان شاء اللہ‘ کامیابی سے ہمکنار ہوگا اور جو آخری تین اوصاف (بحوالہ آیت ۸ اور ۹) کا انتخاب کرے گا وہ بدترین خلائق قرار پائے گا۔

آیت ۱۱ ﴿وَمَا یُغۡنِیۡ عَنۡہُ مَالُہٗۤ اِذَا تَرَدّٰی ﴿۱۱﴾﴾ ’’اور اس کا مال اس کے کچھ کام نہیں آئے گا جب وہ (جہنّم کے) گڑھے میں گرے گا۔‘‘

آیت ۱۲ ﴿اِنَّ عَلَیۡنَا لَلۡہُدٰی ﴿۱۲﴾﴾ ’’(دیکھو انسانو!) یقیناً ہمارے ذِمّے ہے ہدایت پہنچا دینا۔‘‘

اپنے مضمون کے اعتبار سے یہ بہت اہم آیت ہے۔ اس میں واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ انسان کو سیدھا راستہ دکھانا اور ’’ہدایت‘‘ اس تک پہنچانا اللہ تعالیٰ کے ذِمّہ ہے۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو جبلی ہدایت بھی عطا کی ہے‘ اُس کے نفس کے اندر اخلاقی حس بھی الہام کر دی ہے۔ اس کے اندر اپنی روح بھی پھونکی ہے جو اللہ تعالیٰ کی معرفت اور محبّت کی امین ہے اور پھر اس ہدایت و معرفت کی تکمیل کے لیے اس نے دنیا میں پیغمبر بھی بھیجے اور کتابیں بھی نازل کیں۔ گویا اللہ تعالیٰ نے کئی ذرائع سے انسان کو راہِ ہدایت دکھانے کا اہتمام فرما دیا ہے۔

آیت ۱۳ ﴿وَ اِنَّ لَنَا لَلۡاٰخِرَۃَ وَ الۡاُوۡلٰی ﴿۱۳﴾﴾ ’’اور ہمارے ہی لیے ہے اختیار آخرت کا بھی اور دنیا کا بھی۔‘‘

ظاہر ہے آخرت میں اللہ تعالیٰ ہی یہ فیصلہ کرے گا کہ کون انسان کامیاب ہوا ہے اور کون ناکام رہا ہے۔ اور دنیا میں بھی وہی فیصلہ کرتا ہے کہ کون سی قوم اب اُس کی زمین پر بوجھ بننے جا رہی ہے اور اس طرح کے کس بوجھ سے کس وقت اس نے زمین کو آزاد کرنا ہے۔ گزشتہ سورت (سورۃ الشّمس) میں قوم ثمود کے بارے میں اللہ کے ایسے ہی ایک فیصلے کا ذکر ہم بایں الفاظ پڑھ آئے ہیں: ﴿فَدَمۡدَمَ عَلَیۡہِمۡ رَبُّہُمۡ بِذَنۡۢبِہِمۡ فَسَوّٰىہَا ﴿۱۴﴾﴾ ’’تو الٹ دیا اُن پر عذاب اُن کے ربّ نے اُن کے گناہ کی پاداش میں اور سب کو برابر کر دیا‘‘۔ یعنی جب اُس قوم کے پاس اللہ تعالیٰ کا رسولؑ واضح نشانیوں کے ساتھ آ گیا‘ پھر اللہ کے رسولؑ نے اللہ کا پیغام پہنچا کر اور اپنے کردار و عمل کا نمونہ پیش کر کے اس قوم پر اتمامِ حُجّت کر دیا۔ اس کے بعد بھی جب وہ قوم کفر اور سرکشی پر اَڑی رہی تو انہیں ایسے ملیامیٹ کر دیا گیا جیسے کسی باغ کی صفائی کے لیے اس کا سارا کوڑا کرکٹ جمع کر کے اسے آگ لگا دی جاتی ہے۔

آیت ۱۴ ﴿فَاَنۡذَرۡتُکُمۡ نَارًا تَلَظّٰی ﴿۱۴﴾﴾ ’’دیکھو! مَیں نے تمہیں خبردار کر دیا ہے بھڑکتی ہوئی آگ سے۔‘‘

جہنّم تو بھوکے شیر کی طرح اپنے شکار کی تاک میں ہے: ﴿نَزَّاعَۃً لِّلشَّوٰی ﴿۱۶﴾ تَدۡعُوۡا مَنۡ

اَدْبَرَ وَتَوَلّٰی ﴿۱۷﴾ (المعارج) ''وہ کلیجوں کو کھینچ لے گی۔ وہ پکارے گی ہر اُس شخص کو جس نے پیٹھ موڑ لی تھی اور رخ پھیر لیا تھا۔''

آیت ۱۵ ﴿لَا یَصْلٰىهَآ اِلَّا الْاَشْقَى ﴿۱۵﴾﴾ ''نہیں پڑے گا اس میں مگر وہ جو انتہائی بدبخت ہے۔''

ظاہر ہے جس انسان کو آخری رسول (ﷺ) کے آجانے کے بعد بھی حقیقت نظر نہ آئی اس سے بڑا ابدبخت اور کون ہوسکتا ہے اور اس سے زیادہ جہنّم کے گڑھے میں گرنے کا مستحق کون ہوسکتا ہے؟ کیونکہ اگر کوئی شخص اندھیرے میں یا کم روشنی میں ٹھوکر کھا جائے تو اس کی ٹھوکر کا پھر بھی کچھ نہ کچھ جواز بنتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص دن کی روشنی میں اس وقت راستہ پہچاننے سے انکار کر دے جب سورج نصف النہار پر چمک رہا ہو تو ظاہر ہے اس کے لیے وہ خود ہی قصوروار ہو گا۔

آیت ۱۶ ﴿الَّذِیْ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی ﴿۱۶﴾﴾ ''جس نے جھٹلایا اور منہ پھیر لیا۔''

آیت ۱۷ ﴿وَسَیُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ﴿۱۷﴾﴾ ''اور بچا لیا جائے گا اس سے جو انتہائی متقی ہے۔''

اس آیت کے بارے میں تقریباً تمام مفسرین متفق ہیں کہ اس کے مصداق حضرت ابوبکر صدیق ؓ ہیں۔ کیونکہ قبل ازیں آیت ۵ اور ۶ میں جن تین اوصاف کا ذکر ہوا ہے وہ اس اُمّت کی جس شخصیت میں بتمام وکمال نظر آتے ہیں وہ حضرت ابوبکر صدیق ؓ کی شخصیت ہے۔

''تصدیق بالحُسنیٰ'' کے حوالے سے آپؓ کے بارے میں خود حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ مَیں نے جس کسی کو بھی دعوت دی اس نے کچھ نہ کچھ توقف ضرور کیا' سوائے ابوبکرؓ کے۔ انؓ کے سامنے جونہی میں نے اپنی نبوت کا ذکر کیا وہ فوراً مجھ پر ایمان لے آئے۔ آپؓ کے تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ زمانہ جاہلیت میں بھی آپؓ توحید پر کاربند اور بُت پرستی سے دور رہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے میں بھی آپؓ کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ آپؓ نے کئی نادار خاندانوں کی کفالت مستقل طور پر اپنے ذِمّہ لے رکھی تھی۔ مکّہ کے بہت سے غلاموں اور لونڈیوں کو آپؓ نے منہ مانگی قیمت میں خرید کر آزاد کرایا تھا اور غزوۂ تبوک کے موقع پر تو آپؓ نے اپنا پورا اثاثہ لا کر حضور ﷺ کے قدموں میں ڈھیر کر دیا تھا۔ غرض مذکورہ تینوں اوصاف بدرجہ اَتم اُمّت کے مَردوں میں آپؓ کی شخصیت میں' جبکہ خواتین میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ ؓ کی شخصیت میں پائے جاتے ہیں۔

آیت ۱۸ ﴿الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَکّٰی ﴿۱۸﴾﴾ ''جو اپنا مال دیتا ہے اپنے (نفس) کو پاک کرنے کے لیے۔''

یعنی مال خرچ کرتے ہوئے دنیاداری کا کوئی مفاد اس کے پیش نظر نہیں ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے حضرت بلال ؓ کو آزاد کرانے کے لیے اُمیہ بن خلف کو جب منہ مانگی قیمت ادا کی تو اس پر اُمیہ خود بھی حیران رہ گیا۔ دوسری طرف حضرت ابوبکر ؓ کے والد حضرت ابوقحافہ ؓ (آپؓ فتح مکّہ کے بعد ایمان لائے تھے) نے بھی آپؓ سے گلہ کیا کہ اتنی بڑی رقم تم نے کسی طاقتور غلام پر کیوں نہ خرچ کی جو تمہارے کام بھی آتا! (اُس زمانے میں اگر کوئی شخص کسی غلام کو آزاد کراتا تھا تو وہ غلام زندگی بھر اسی شخصیت کے حوالے سے پہچانا جاتا تھا اور اخلاقی لحاظ سے بھی وہ اس کے تابع رہتا تھا۔ عرب رواج کے مطابق ایسے آزاد کردہ غلام کو متعلقہ شخصیت کا مولیٰ کہا جاتا تھا' جیسے حضرت زید بن حارثہ ؓ اور حضرت ثوبان ؓ حضور ﷺ کے مولیٰ تھے۔) بہرحال مال خرچ کرنے کا یہ فلسفہ ان لوگوں کی سمجھ سے بالا ہے جن کی نظر ہر وقت دنیا کے مفادات پر رہتی ہے۔

آیت ۱۹ ﴿وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰۤی ﴿۱۹﴾﴾ ''اور اس کے ذِمّے کسی کا احسان نہیں جس کا وہ بدلہ چکا رہا ہو۔''

آیت ۲۰ ﴿اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰی ﴿۲۰﴾﴾ ''بلکہ (وہ تو خرچ کر رہا ہے) صرف اپنے بلند و برتر پروردگار کی رضاجوئی کے لیے۔''

آیت ۲۱ ﴿وَلَسَوْفَ یَرْضٰی ﴿۲۱﴾﴾ ''اور وہ عنقریب راضی ہو جائے گا۔''

یہاں پر یَرْضٰی کی ضمیر کا اشارہ بیک وقت اللہ تعالیٰ کی طرف بھی ہے اور اُس شخصیت کی طرف بھی جس کی صفات کا ذکر ان آیات میں ہو رہا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ بھی راضی ہو جائے گا اور ابوبکر صدیق ؓ بھی راضی ہو جائیں گے۔ گویا یہ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ جیسی بشارت ہے کہ اگر اللہ کا یہ بندہ اپنا مال صرف اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کے لیے لٹا رہا ہے تو اللہ تعالیٰ ضرور اس سے راضی ہو جائے گا اور پھر اللہ تعالیٰ اس کو آخرت میں اتنا کچھ عطا کرے گا کہ وہ بھی خوش ہو جائے گا۔ یہاں یہ اہم نکتہ بھی نوٹ کر لیجیے کہ معنوی اعتبار سے اس آیت کا اگلی سورت (سورۃ الضحیٰ) کی آیت ۵ کے ساتھ خصوصی ربط و تعلق ہے جس کی وضاحت سورۃ الضحیٰ کے مطالعہ کے

دوران کی جائے گی۔

یہاں پر زیر مطالعہ سورتوں (سورۃ الشمس، سورۃ اللیل، سورۃ الضحیٰ اور سورۃ الانشراح) کے مرکزی مضمون کے اہم نکات ایک دفعہ پھر اپنے ذہن میں تازہ کر لیجیے۔ سورۃ الشمس کی ابتدائی آٹھ آیات قسموں پر مشتمل ہیں۔ اس کے بعد مقسم علیہ کے طور پر یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ نفسِ انسانی کے اندر نیکی اور بدی کا شعور ودیعت کر دیا گیا ہے، اور پھر اس کے بعد دو آیات میں اس حوالے سے کامیابی اور ناکامی کا معیار بھی بتا دیا گیا ہے: ﴿قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَکّٰىہَا ۙ﴿۹﴾ وَ قَدۡ خَابَ مَنۡ دَسّٰىہَا ﴿ؕ۱۰﴾﴾ کہ جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کر لیا وہ کامیاب ٹھہرا اور جس نے اسے مٹی میں دفن کر دیا وہ ناکام ہو گیا۔ اگلی سورت یعنی سورۃ اللیل میں نفس کو سنوارنے اور بگاڑنے کے طریقوں یا راستوں کے بارے میں مزید وضاحت کر دی گئی ہے کہ جو انسان اِعطائے مال، تقویٰ اور تصدیق بالحسنیٰ کے اوصاف اپنائے گا وہ صدیقیت اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے راستے پر گامزن ہو جائے گا۔ اس کے برعکس بخل، استغناء (حلال وحرام اور جائز و ناجائز سے متعلق لاپرواہی) اور حق کی تکذیب کی راہ پر چلنے والا انسان بالآخر خود کو جہنّم کے گڑھے میں گرائے گا۔ پھر کامیابی کے راستے کی مثال کے طور پر اُمّت کی ایک ایسی شخصیت کی طرف اشارہ بھی کر دیا گیا جسے پہلے تین اوصاف کو اپنانے کے باعث اعلیٰ مدارج ومراتب سے نوازا گیا۔ لیکن ظاہر ہے اس منزل کا بلند ترین مقام تو محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے لیے مختص ہے جو معراجِ انسانیت ہیں۔

چنانچہ اس مضمون کے حوالے سے اب اگلی دو سورتوں کا تعلق خصوصی طور پر حضور ﷺ کی ذاتِ اَقدس سے ہے۔ اسی نسبت سے ان سورتوں کا مطالعہ سیرت النبی ﷺ کے بعض پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے بھی مفید ہے۔ متقدمین میں سے تصوّف کا ذوق رکھنے والے اکثر مفسّرین نے ان سورتوں میں بعض باطنی حقائق کی نشاندہی بھی کی ہے۔ (متعلقہ آیات کے مطالعہ کے دوران جہاں جس حد تک ممکن ہوا ایسے کچھ نکات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی۔) ظاہر ہے موجودہ دور کے ''عقلیت پسند'' مفسّرین نہ تو تصوّف کا ذوق رکھتے ہیں اور نہ ہی انہیں ایسے موضوعات سے دلچسپی ہے۔ (الّا ماشاء اللہ!)

❁❁❁

اخلاصِ نیّت کی اہمیت

قرآن واحادیث کی روشنی میں

خورشید انجم ☆

قرآن اکیڈمی، لاہور میں ۲۱ جون ۲۰۲۴ء کا خطابِ جمعہ

خطبہ مسنونہ اور تلاوتِ آیات کے بعد:

قرآن مجید کی یہ آیت اکثر عید الاضحیٰ اور قربانی کے دنوں میں خطبات میں بیان کی جاتی ہے:

﴿لَنۡ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوۡمُہَا وَلَا دِمَآؤُہَا وَلٰکِنۡ یَّنَالُہُ التَّقۡوٰی مِنۡکُمۡ ؕ﴾ (الحج:۳۷)

’’اللہ تک نہ تو ان کے گوشت پہنچتے ہیں اور نہ ان کے خون، لیکن اُس تک پہنچتا ہے تمہاری طرف سے تقویٰ۔‘‘

اللہ تعالیٰ کو قربانی کے جانوروں کا خون نہیں پہنچتا بلکہ جس تقویٰ اور اخلاصِ نیت کے ساتھ تم اللہ کی راہ میں قربانی کرتے ہو وہ اللہ کو مقصود ہے۔ اگر یہ اخلاصِ نیت نہیں ہے تو پھر کسی عمل کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ جیسا کہ اقبال نے کہا: ؎

رہ گئی رسمِ اذاں، روحِ بلالی نہ رہی   فلسفہ رہ گیا، تلقینِ غزالی نہ رہی

اور: ؎

نماز و روزہ و قربانی و حج   یہ سب باقی ہے، تُو باقی نہیں ہے!

نمازیں بھی پڑھی جارہی ہیں، روزے بھی رکھے جارہے ہیں، قربانیاں بھی بڑھ چڑھ کر ہورہی ہیں، حج میں بھی ماشاء اللہ مسلمانوں کی اس قدر بڑی تعداد شرکت کر رہی ہے کہ سعودی حکومت کے لیے سنبھالنا مشکل ہوجاتا ہے۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے مگر اس کے باوجود اُمّتِ مسلمہ

☆ مرکزی ناظم نشرواشاعت تنظیم اسلامی

کی حالت دن بدن خراب ہوتی جارہی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ان سب اعمال کی جو روح تھی وہ اب باقی نہیں رہی، اور وہ روح اخلاصِ نیت ہے۔ ہم جو کام بھی کر رہے ہیں وہ کس نیت اور ارادہ کے ساتھ کر رہے ہیں، یہ دیکھنے کی اصل بات ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لَیۡسَ الۡبِرَّ اَنۡ تُوَلُّوۡا وُجُوۡہَکُمۡ قِبَلَ الۡمَشۡرِقِ وَالۡمَغۡرِبِ وَلٰکِنَّ الۡبِرَّ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَالۡمَلٰٓئِکَۃِ وَالۡکِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ ۚ﴾ (البقرۃ:۱۷۷)

’’نیکی یہی نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے مشرق اور مغرب کی طرف پھیر دو، بلکہ نیکی تو اُس کی ہے جو ایمان لائے اللہ پر، یومِ آخرت پر، فرشتوں پر، کتاب پر اور نبیوں پر۔‘‘

ہر عمل کے دو پہلو ہیں: ایک اس کا ظاہر ہے اور ایک باطن۔ ایک اس کا ڈھانچا ہے، ہیئت ہے جبکہ ایک اس کی باطنی کیفیت ہے۔ جیسا کہ نماز کا ظاہر اس کا قیام، رکوع اور سجود ہیں، یہ سارا اس کا ڈھانچا ہے، جبکہ اس کی باطنی کیفیت خشوع وخضوع ہے، انابت الی اللہ ہے اور رجوع الی اللہ کی کیفیت ہے۔ اگر یہ کیفیت نہیں ہے تو پھر سب کچھ بے سود ہے۔ ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ ایک زمانہ آئے گا کہ پوری جماعت کے اندر ایک شخص بھی خضوع وخشوع والا نہیں ہوگا، سب خشوع سے خالی ہوں گے۔ اسی طرح ہر عمل کا ایک ظاہر ہے اور ایک اس کا باطن ہے۔ اسی موضوع کو آیت البر میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اعمال نیکی ہیں لیکن آیت البر میں یہ بتایا جارہا ہے کہ اصل میں تو نیکی ایمان ہے۔ ایمان ہی درحقیقت کسی عمل کے محرک کو معیّن کرتا ہے۔ نیکی کس لیے کی جانی چاہیے، اس کا مقصد یہاں بیان کر دیا گیا۔ اگر اللہ پر اور آخرت پر ایمان ہے اور اللہ کو راضی کرنے کے لیے کوئی کام کیا جارہا ہے تو وہ نیکی ہے، اگر یہ مقصود نہیں ہے تو پھر وہ عمل نیکی نہیں ہے۔ حضرت عمر بن الخطاب ؓ سے روایت ہے کہ میں نے خود نبی اکرم ﷺ سے سنا، آپ ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ، وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوٰى))

’’اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے اور ہر شخص کے لیے وہی کچھ ہے جس کی اس نے نیت کی تھی۔‘‘

یہ دیکھا جائے گا کہ کس نیت کے ساتھ کوئی عمل کیا جارہا ہے۔ بعض اوقات ہمیں محسوس ہوجاتا ہے کہ نیت وہ نہیں ہے جو دکھائی دے رہی ہے۔ جیسا کہ الیکشن کے دنوں میں سیاست دان گلی محلوں میں جاتے ہیں، میلے کچیلے بچوں کو بھی اُٹھا کر پیار کر رہے ہوتے ہیں، لوگوں سے ہاتھ ملاتے ہیں، گلے ملتے ہیں، شادی غمی میں جارہے ہوتے ہیں لیکن ہر شخص زیرِ لب

مسکرا رہا ہوتا ہے کہ اس کا مقصد ہمارے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد الیکشن جیتنا ہے۔ جیسے ہی یہ جیت گیا تو اُس کے بعد اس کا سایہ بھی نظر نہیں آئے گا۔ البتہ بعض اوقات انسان کی نیت معلوم نہیں ہو سکتی کہ وہ کس مقصد کے تحت کوئی عمل کر رہا ہے۔ مثال کے طور پر کسی نے کوئی فاؤنڈیشن بنائی اور لوگوں کی مدد کر رہا ہے‘ خدمتِ خلق کے کام ہو رہے ہیں‘ کوئی ڈسپنسری کھول دی ہے‘ ہسپتال بنا دیا ہے‘ اسی طرح کا کوئی اور کام کر دیا ہے۔ وہ بظاہر اچھا کام ہے‘ لوگ اس کی تعریف بھی کرتے ہیں لیکن اس کا اصل مقصد اور نیت معلوم نہیں ہوتی کہ وہ یہ سب کیوں کر رہا ہے! یہ تو وہی جانتا ہے یا اس کا رب جانتا ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی انکم ٹیکس سے بچنے کے لیے کر رہا ہو یا کوئی اور ایسا مقصد ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ کی رضا کے لیے کر رہا ہو۔ اس حدیث میں یہ بتا دیا گیا کہ جس کی جو نیت ہوگی اسی کے مطابق اسے صلہ ملے گا۔ اللہ تو دلوں کے حال جانتا ہے۔ فرمایا:

﴿وَنَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَيۡهِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِيۡدِ ۝۱۶﴾ (قٓ)

’’اور ہم تو اُس سے اُس کی رگِ جاں سے بھی زیادہ قریب ہیں۔‘‘

اور:

﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلِيۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ۝۱۱۹﴾ (آل عمران)

’’یقیناً اللہ تعالیٰ جو کچھ سینوں کے اندر مضمر ہے اس سے بھی واقف ہے۔‘‘

حدیث میں آگے فرمایا:

’’پس جس کی ہجرت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی جانب ہے تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول ہی کی جانب ہے‘ اور جس کی ہجرت دنیا کے لیے ہے کہ اسے کمائے یا کسی عورت کے لیے ہے کہ اس سے نکاح کرے تو اس کی ہجرت اُسی کی جانب ہے جس کی خاطر اُس نے ہجرت کی۔‘‘

مدینہ منورہ کی طرف ہجرت سے پہلے دو مرتبہ ہجرتِ حبشہ ہوئی ہے لیکن وہ رضا کارانہ تھی۔ جو لوگ قریش کے ظلم و ستم اور تشدد کو برداشت نہیں کر سکتے تھے تو اللہ کے نبی ﷺ نے ان کو اجازت دی تھی کہ وہ حبشہ کی طرف ہجرت کر جائیں‘ لیکن یہ ہجرت سب پر فرض نہیں تھی۔ البتہ مدینہ کی طرف ہجرت سب مسلمانوں پر فرض تھی کیونکہ اب مدینہ کو بیس کیمپ بنایا جا رہا تھا۔ زیر مطالعہ حدیث میں ہجرتِ مدینہ ہی مراد ہے کہ جس نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی خاطر ہجرت کی تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لیے ہے اور جس نے دنیا

کے لیے ہجرت کی تو اس کی ہجرت دنیا کے لیے ہے۔ اب ایک شخص کا کاروبار مسلمانوں کے ساتھ تھا‘ مسلمان مدینہ چلے گئے تو اس کا کاروبار بند ہو گیا جس کی وجہ سے وہ بھی مدینہ ہجرت کر گیا تو اس کی یہ ہجرت دنیا کے لیے ہوگی۔ اسی طرح ایک شخص مہاجر اُمِ قیس کے نام سے مشہور ہو گیا کیونکہ اُمِ قیس ایک مسلمان خاتون تھیں جو مہاجر ہو کر مدینہ چلی گئیں۔ یہ صاحب بھی ان سے نکاح کی غرض سے ہجرت کر کے مدینہ چلے گئے۔ اس لیے حدیث میں فرمایا گیا کہ جس کی ہجرت کسی خاتون سے نکاح کی غرض سے تھی تو اس کی ہجرت اسی جانب ہے۔ یعنی اس کے لیے آخرت میں کوئی اجر نہیں ہے۔

یہی بات ایک دوسری حدیث میں واضح کی گئی۔ حضرت ابوہریرہ ؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

’’جب قیامت کا دن ہوگا اللہ تعالیٰ بندوں کے درمیان فیصلہ فرمانے کے لیے ان کی طرف (زمین پر) نزول فرمائے گا۔ اُس وقت ہر جماعت گھٹنوں کے بل جھکی ہوئی ہوگی۔ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ جن اشخاص کو بلائے گا ان میں ایک آدمی وہ ہوگا جس نے قرآن پاک زبانی یاد کیا ہوگا‘ اور ایک آدمی وہ ہوگا جو اللہ کی راہ میں شہید کیا گیا ہوگا اور ایک بہت مال دار آدمی ہوگا۔ اللہ تعالیٰ قرآن کے قاری سے کہیں گے: کیا مَیں نے تجھے وہ کتاب نہیں سکھائی جو مَیں نے اپنے رسول ﷺ پر نازل کی تھی؟ وہ کہے گا: ہاں میرے ربّ! ایسا ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: پھر تُو نے جو علم حاصل کیا اس پر کہاں تک عمل کیا؟ وہ جواب دے گا: مَیں رات دن اس (کی تلاوت اور درس و تدریس) میں مشغول رہتا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا: تُو نے جھوٹ کہا۔ اور فرشتے بھی اس سے کہیں گے: تُو نے جھوٹ کہا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: بلکہ تم تو یہ چاہتے تھے کہ کہا جائے: فلاں آدمی بڑا قاری ہے‘ سو وہ (دنیا میں) کہا جا چکا۔

پھر مال دار شخص کو حاضر کیا جائے گا تو اللہ تعالیٰ اُس سے پوچھے گا: کیا مَیں نے تجھ پر مالی آسودگی نہیں فرمائی یہاں تک کہ تجھے کسی کا محتاج نہیں رہنے دیا؟ وہ کہے گا: اے میرے ربّ! ایسا ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: پھر تُو نے میرے دیے ہوئے مال کا کیا کیا؟ وہ کہے گا: مَیں اس کے ذریعے رشتہ داروں پر خرچ کرتا تھا اور (ضرورت مندوں پر) صدقہ کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تُو نے جھوٹ کہا۔ اور فرشتے بھی کہیں گے: تُو نے جھوٹ کہا۔ اور اللہ تعالیٰ فرمائے گا: بلکہ تیری خواہش تو یہ تھی کہ کہا جائے فلاں بڑا سخی ہے‘

سووہ (دنیا میں) کہا جا چکا۔

اسی طرح اللہ کی راہ میں قتل ہونے والے کو حاضر کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اُس سے پوچھے گا: تجھے کس لیے قتل کیا گیا؟ وہ کہے گا: مجھے تیری راہ میں جہاد کا حکم ملا' چنانچہ میں جنگ کرتا رہا حتیٰ کہ مجھے قتل کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ اُس سے فرمائے گا: تُو جھوٹ کہتا ہے۔ اور فرشتے بھی اس سے کہیں گے: تُو جھوٹ کہتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ فرمائے گا: بلکہ تُو صرف یہ چاہتا تھا کہ کہا جائے: فلاں شخص بہت بہادر ہے' سووہ (دنیا میں) کہا جا چکا۔''

(پھر حضرت ابوہریرہ ؓ کہنے لگے:) اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے میرے گھٹنے پر ہاتھ مار کر فرمایا: ''اے ابوہریرہ! قیامت کے روز اللہ کی مخلوق میں یہ سب سے پہلے تین اشخاص ہوں گے جن (کے جہنم میں جھونکے جانے) سے جہنم بھڑک اُٹھے گی۔''

(سنن الترمذی' ابواب الزھد' ح:۲۳۸۲)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نیت اور اخلاصِ نیت کی کتنی اہمیت ہے۔ اسی طرح ایک اور حدیث میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ صَلّٰى يُرَائِي فَقَدْ أَشْرَكَ، وَمَنْ صَامَ يُرَائِي فَقَدْ أَشْرَكَ، وَمَنْ تَصَدَّقَ يُرَائِي فَقَدْ أَشْرَكَ)) (رواہ احمد)

''جو شخص دکھلاوے کی خاطر نماز پڑھتا ہے تو اس نے شرک کیا' جو شخص دکھلاوے کی خاطر روزہ رکھتا ہے تو اس نے شرک کیا' اور جو شخص دکھلاوے کی خاطر صدقہ کرتا ہے تو اس نے شرک کیا۔''

شرک دو قسم کا ہے۔ ایک شرک جلی ہے اور دوسرا شرک خفی۔ شرک جلی وہ ہے جیسے کسی بُت کو سجدہ کر لیا' کسی قبر پر ماتھا ٹیک دیا یا کسی دیوی کی پوجا کر لی' جبکہ شرک خفی ریاکاری ہے۔ جیسے بندہ نماز پڑھ رہا ہے اور اسے احساس ہوا کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے تو اس نے سجدہ تھوڑا طویل کر لیا۔ وہ شرک کر چکا۔ یہ شرک خفی غیر محسوس انداز میں عمل پزیر ہوتا ہے کہ انسان کو پتا بھی نہیں چلتا' جیسے حدیث میں کہا گیا کہ ریا اور دکھاوا ایسا شرک ہے جو چیونٹی کے انداز و رفتار سے انسان کے عمل میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس سے بچنے کے لیے اخلاص ضروری ہے۔ اللہ کے نبی ﷺ سے پوچھا گیا: یارسول اللہ ﷺ! ایمان کیا ہے؟ فرمایا: ((الاخلاص))۔ یعنی ایمان اور اخلاص ایک ہی ہیں۔ ایمان میں اگر اخلاص نہیں ہوگا تو ایسا ایمان قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ آپ ﷺ نے

فرمایا: ''اللہ تعالیٰ اس اُمت کی اُس کے ضعیفوں کی دعاؤں سے' ان کی نمازوں سے اور اخلاص کی برکت سے مدد کرتا ہے۔'' اللہ کی مدد خالص نیت کے ساتھ عمل کرنے سے آتی ہے۔ فرمایا:

﴿فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝۲﴾ (الزمر)

''پس بندگی کرو اللہ کی اپنی اطاعت کو اُس کے لیے خالص کرتے ہوئے۔''

یعنی بندگیٔ رب میں کسی اور کو شریک نہ کرو' سجدہ کرو تو صرف اللہ کے لیے کرو۔ نماز ہے تو صرف اللہ کے لیے ہے۔ روزہ' حج' قربانی اور ہر عمل صرف اللہ کے لیے ہو۔ اللہ کے دین کی دعوت کا کام کر رہے ہیں تو صرف اللہ تعالیٰ سے اجر کی امید ہو۔ غلبہ و اقامتِ دین کی کوشش' محنت اور جدّوجُہد ہو رہی ہے تو وہ بھی صرف اللہ کی رضا اور آخرت کی فلاح کے لیے ہو۔ اس میں کسی قسم کی ملاوٹ نہیں ہونی چاہیے' ورنہ بظاہر بڑی بھاگ دوڑ بھی ہو رہی ہوگی' بہت کچھ ہو رہا ہوگا لیکن آخرت میں انجام خدانخواستہ اس شہید' عالم اور سخی جیسا نہ ہو جائے جس کا ذکر پہلے آ چکا۔ اس حوالے سے بہت زیادہ فکرمندی اور خوداحتسابی کی ضرورت ہے۔ اسی طرح دعا بھی صرف اللہ ہی سے مانگنی چاہیے۔ فرمایا:

﴿فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ﴾ (المومن:۱۴)

''پس تم پکارو اللہ کو اُسی کے لیے اطاعت کو خالص کرتے ہوئے''

اس اخلاص سے دعا مانگنے پر اللہ تعالیٰ مصیبتوں سے نجات دے دیتے ہیں۔ جب دعا واقعتاً دل سے نکلتی ہے تو وہ اثر رکھتی ہے۔ بقول اقبال:

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پَر نہیں' طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

عبداللہ بن عمر ؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: تین اشخاص کہیں باہر جا رہے تھے کہ اچانک بارش ہونے لگی۔ انہوں نے ایک پہاڑ کے غار میں جا کر پناہ لی۔ اتفاق سے پہاڑ کی ایک چٹان اوپر سے لڑھکی اور اس غار کے منہ کو بند کر دیا جس میں یہ تینوں پناہ لیے ہوئے تھے۔ اب ایک نے دوسرے سے کہا کہ اپنے سب سے اچھے عمل کا جو تم نے کبھی کیا ہو' نام لے کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرو۔ اس پر ان میں سے ایک نے یہ دعا کی: اے اللہ! میرے ماں باپ بہت ہی بوڑھے تھے۔ میں باہر جا کر اپنے مویشی چَراتا تھا۔ پھر جب شام کو واپس آتا تو ان کا دودھ نکالتا اور برتن میں پہلے اپنے والدین کو پیش کرتا۔ جب میرے والدین پی لیتے تو پھر بیوی بچوں اور گھر والوں کو پلاتا۔ اتفاق سے ایک رات مجھے دیر ہوگئی اور جب میں گھر لوٹا تو والدین سو چکے

تھے۔ اس نے کہا کہ پھر میں نے پسند نہیں کیا کہ انہیں جگاؤں۔ بچے میرے قدموں میں بھوکے پڑے رو رہے تھے‘ میں برابر دودھ کا پیالہ لیے والدین کے سامنے اسی طرح کھڑا رہا یہاں تک کہ صبح ہوگئی۔ اے اللہ! اگر تیرے نزدیک میں نے یہ کام صرف تیری رضا حاصل کرنے کے لیے کیا تھا تو ہمارے لیے تو اس چٹان کو ہٹا کر اتنا راستہ بنا دے کہ ہم آسمان کو دیکھ سکیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: چنانچہ وہ پتھر کچھ ہٹ گیا۔ دوسرے شخص نے دعا کی: اے اللہ! تُو خوب جانتا ہے کہ مجھے اپنے چچا کی ایک لڑکی سے اتنی زیادہ محبت تھی جتنی ایک مرد کو کسی عورت سے ہوسکتی ہے۔ (ایک مرتبہ انتہائی مجبوری میں) اس لڑکی نے کہا: تم مجھ سے اپنی خواہش اس وقت تک پوری نہیں کر سکتے جب تک مجھے سو اشرفی نہ دے دو۔ میں نے ان کے حاصل کرنے کی کوشش کی اور آخر اتنی اشرفیاں جمع کر لیں۔ پھر جب میں اس سے اپنی حاجت پوری کرنے بیٹھا‘ تو وہ بولی: اللہ سے ڈر اور مہر کو ناجائز طریقے پر نہ توڑ۔ اس پر مَیں کھڑا ہوگیا اور میں نے اسے چھوڑ دیا۔ اب اگر تیرے نزدیک میں نے یہ عمل تیری ہی رضا کے لیے کیا تھا تو ہمارے لیے نکلنے کا راستہ بنا دے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: چنانچہ وہ پتھر دو تہائی ہٹ گیا۔ تیسرے شخص نے دعا کی: اے اللہ! تُو جانتا ہے کہ میں نے ایک مزدور ایک ’فرق‘ جوار کے عوض کام پر لگایا۔ جب میں اسے دینے لگا تو اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ میں نے اس جوار کو لے کر بو دیا۔ اس میں اتنی برکت ہوئی کہ میں نے اس سے ایک بیل اور چرواہا خرید لیا۔ کچھ عرصہ بعد اس نے آ کر مزدوری مانگی کہ: اے اللہ کے بندے! مجھے میرا حق دے دے۔ میں نے کہا: اس بیل اور چرواہے کے پاس جاؤ‘ وہ سب تمہارا ہی ہے۔ اس نے کہا: مجھ سے مذاق کرتے ہو! میں نے کہا: میں مذاق نہیں کرتا‘ واقعی یہ تمہارے ہی ہیں۔ اے اللہ! اگر تیرے نزدیک یہ کام میں نے تیری رضا حاصل کرنے کے لیے کیا تھا تو ہمارے لیے اس چٹان کو ہٹا کر راستہ بنا دے! چنانچہ وہ پتھر ان سے ہٹ گیا۔ (متفق علیہ)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ خالصتاً اللہ کے لیے کیا گیا عمل اللہ کی مدد کا سبب بنتا ہے۔ اخلاص کے ساتھ کیا گیا ہر عمل اللہ تعالیٰ قبول فرماتا ہے۔ اسی لیے فرمایا:

((إِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ لَا يَقْبَلُ مِنَ الْعَمَلِ إِلَّا مَا كَانَ لَهُ خَالِصًا وَابْتُغِيَ بِهِ وَجْهُهُ)) (سنن النسائی:۳۱۴)

’’بے شک اللہ عزوجل صرف وہی عمل قبول کرتا ہے جو اُسی کے لیے خالص ہو اور اُس کی

رضا کے لیے کیا گیا ہو۔‘‘

نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا: اگر کوئی شخص اخلاصِ نیت کے ساتھ عمل کر رہا ہو اور اس کا دکھاوے کا کوئی ارادہ نہ ہو‘ اس کے باوجود اگر کسی کو اطلاع ہو جائے تو کیا یہ بھی ریا میں آئے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’نہیں‘ بلکہ اس کے لیے تو دُہرا اجر ہے۔ ایک اس کے اخلاصِ نیت کا اجر اور دوسرا اس کا راز کھل جانے پر بھی اللہ اس کو اجر عطا فرمائیں گے۔‘‘

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جو کام بھی کیا جائے‘ خالصتاً اللہ کی رضا کے لیے کیا جائے‘ اُخروی فلاح کو مدِّنظر رکھ کر کیا جائے‘ ورنہ خود کو تھکا دینے والی بات ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ع

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم‘ نہ اِدھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے!

اس لیے ہر عمل میں اخلاص نیت کی کوشش کرنی چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ لَا يَنْظُرُ إِلٰى صُوَرِكُمْ وَلَا أَمْوَالِكُمْ، وَلٰكِنْ يَنْظُرُ إِلٰى قُلُوْبِكُمْ وَأَعْمَالِكُمْ)) (صحیح مسلم:۵۳۱۴)

’’اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور مال و دولت کو نہیں دیکھتا بلکہ وہ تمہارے دلوں کو اور اعمال کو دیکھتا ہے۔‘‘

وہ دیکھتا ہے کہ کس نیت سے عمل کیا جا رہا ہے‘ کس جذبے کے تحت کیا جا رہا ہے۔ انسان کے اندر اگر یہ احساس بیدار ہو جائے تو اس کی شخصیت و کردار میں بھی نکھار آئے گا اور اگر کسی قوم‘ کسی جماعت کے اندر یہ صفات پیدا ہو جائیں تو وہ جماعت بھی ترقی کرے گی۔ اللہ تعالیٰ اس کو اس دنیا میں بھی سرخروئی عطا فرمائے گا۔ جیسے کہ حدیث ہے:

((إِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ أَقْوَامًا وَيَضَعُ بِهِ آخَرِينَ))

(صحیح مسلم:۱۴۱۲)

’’اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعے بہت سے قوموں کو بلند کرے گا اور اسی کتاب کے ذریعے بہت سی اقوام کو پست و ذلیل کرے گا۔‘‘

صحابہ کرام ؓ کی جو جماعت تھی وہ ریا‘ نفاق‘ شرک اور ہر قسم کی ایسی برائیوں سے پاک تھی اور ان کے مدِّنظر اعلیٰ ترین مقاصد تھے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی رضا اور آخرت کی فلاح کے لیے اپنی جانیں دیں اور اموال خرچ کیے۔ اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے انہوں نے اپنی

(قبائلی) زندگیوں کو وقف کر دیا تھا۔

ایک صاحب نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا: ایک شخص (قبائلی) حمیت کی خاطر جنگ کرتا ہے‘ ایک شخص بہادری دکھانے کے لیے جنگ کرتا ہے‘ اور ایک شخص ریاکاری کے لیے جنگ کرتا ہے‘ تو ان میں سے کون ہے جو اللہ کی راہ میں جنگ کرتا ہے؟ اس پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ قَاتَلَ لِتَكُونَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا فَهُوَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ))

(متفق علیہ)

’’جو اللہ کے کلمے کو سربلند کرنے کے لیے لڑے‘ وہی اللہ کی راہ میں (لڑتا) ہے۔‘‘

یہی جماعتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے پیشِ نظر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس جماعت کو قبول فرمایا۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اخلاصِ نیت عطا فرمائے‘ اخلاصِ نیت والے اعمال نصیب فرمائے اور انہیں اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے۔ آمین!

❁ ❁ ❁

بقیہ: مدیر ’’مفاہیم‘‘ کی چند فکری غلطیاں

ظاہر ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے جو قتال کیا اس کی شکل تو جنگ ہی کی تھی‘ لیکن پاکستان کے معروضی حالات میں اپنی مسلمان افواج کے خلاف جنگ کی صورت اختیار کرنا یا چھاپہ مار کارروائیاں کرنا یا بم دھماکے کرنا یا بے گناہ لوگوں پر حملے کرنا‘ یہ کوئی اسلام کی خدمت نہیں بلکہ اقامتِ دین کا راستہ روکنے کے مترادف ہے۔ لہٰذا ’’مفاہیم‘‘ کے مدیرِ محترم سے ہماری درخواست ہے کہ وہ اپنی غلط فہمیوں کو دور کریں‘ فکری کجی کو ختم کرنے کی کوشش کریں اور خود بھی غلبۂ دین کی جِدّ و جُہد میں حصّہ لیں‘ نہ یہ کہ جو لوگ خلوص و اخلاص کے ساتھ یہ جِدّ و جُہد کر رہے ہیں‘ ان کے راستے میں روڑے اٹکانے کی کوشش میں لگے رہیں یا ان کی تحریک کے بارے میں تیکھے اور استہزائیہ انداز میں بلکہ کسی قدر حقارت کے ساتھ معاشرے میں شکوک و شبہات اور غلط فہمیاں پھیلاتے رہیں۔ یہ اس مؤقر جریدے کے نام اور مقام کے شایانِ شان نہیں۔ بقول غالب: ؎

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہی کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے!

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں بھی اور آپ کو بھی ہدایت عطا فرمائے۔ آمین یا ربّ العالمین!

قیامِ پاکستان کی بنیاد اور ہماری ذِمّہ داریاں

ممتاز ہاشمی

آج جب افراد‘ حکومت اور تنظیمیں بڑے جوش وخروش اور تیاری کے ساتھ پاکستان کی آزادی کی سالگرہ منانے کی تیاریوں میں مصروف ہیں تو یہ موقع اس بات کا متقاضی ہے کہ قیامِ پاکستان کے تصوّر اور اس کے پس منظر کا ازسرِنو جائزہ لیا جائے۔ ان تمام حالات و واقعات کا تجزیہ کیا جائے جو پاکستان کے قیام کا باعث بنے۔ اس بات کا ادراک ہو کہ آج ہم کس مقام پر کھڑے ہیں اور مستقبل کے لیے کون سا لائحہ عمل ترتیب دینے کی ضرورت ہے۔

پاکستان کی تخلیق ایک معجزہ ہے اور بقول ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ‘ قرآن میں اس کی تمثیل ان آیات میں ملتی ہے:

﴿وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۲۶﴾ (الانفال)

’’اور اس حالت کو یاد کرو جب کہ تم زمین میں قلیل تھے کمزور شمار کیے جاتے تھے‘ اس اندیشہ میں رہتے تھے کہ تم کو لوگ نوچ کھسوٹ نہ لیں‘ سو اللہ نے تم کو رہنے کی جگہ دی اور تم کو اپنی نصرت سے قوت دی اور تم کو بہترین پاکیزہ رزق عطا فرمایا تاکہ تم شکر کرو۔‘‘

پاکستان کا قیام کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی رحمت سے اسے ممکن بنایا۔ دراصل اس کے ذریعے ہمارے بزرگوں کے وعدے‘ عزم اور عمل کو جانچنا مقصود تھا۔

قیامِ پاکستان کی فکری بنیاد قرآن کے عظیم سکالر علامہ اقبال نے رکھی۔ ان کے دور میں پوری ملّتِ اسلامیہ غلامی میں جکڑی ہوئی تھی۔ دنیا کے کسی بھی علاقے میں اسلام کا نظام نافذ نہ تھا۔ دین اسلام کا کامل تصوّر ختم ہو گیا تھا اور مسلمانوں میں ذہنی غلامی اور پس ماندگی مکمل طور پر سرایت کر چکی تھی۔ دینِ اسلام مکمل طور پر مغلوب ہو چکا تھا اور مسلمانوں میں اسلام صرف مذہبی عبادات اور رسومات تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ ان حالات میں علامہ اقبال کو اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت عطا کی کہ وہ

مسلمانوں کو بھولا ہوا سبق یاد دلا کر ان میں اسلام کے غلبے اور عظمت کو بحال کرنے کا عزم پیدا کریں۔

علامہ اقبال نے مسلمانوں کو نہ صرف ان کے زوال کی وجوہات سے آگاہ کیا بلکہ اس صورتِ حال سے نکلنے کا راستہ بھی دکھایا۔ انہوں نے اپنا پیغام اردو اور فارسی میں شاعری اور نثر کی صورت میں پیش کیا اور دین اسلام کے احیاء و نفاذ کے لیے عملی لائحہ عمل فراہم کیا۔

بطور صدر مسلم لیگ‘ انہوں نے احیاء اسلام کے لیے پاکستان کا تصوّر دیا۔ اس کے مطابق ایک نئی مسلم مملکت ہندوستان کے مسلم اکثریتی آبادی والے صوبوں پر مشتمل ہوگی۔ اس میں دین اسلام کے مکمل نفاذ کا موقع ملے گا اور یہ ریاست خلافت راشدہ کا ماڈل ہوگی۔ تمام دُنیا عدل پر مبنی اس نظام کے ثمرات دیکھے گی اور اس طرح اسلام کی طرف مائل ہو جائے گی۔ پھر آہستہ آہستہ دین اسلام دنیا بھر میں نافذ ہونے لگے گا۔ اس کام کے لیے قائدانہ کردار ادا کرنے کے لیے علامہ اقبال نے قائد اعظم کو قائل کیا۔ یہ وہ وقت تھا جب قائد اعظم مسلم لیگ کے رہنماؤں کے رویوں سے مایوس ہو کر لندن منتقل ہو چکے تھے۔ پھر انہوں نے ہندوستان واپس آ کر اس عظیم مشن کی تکمیل کے لیے جدّوجُہد شروع کی۔ اقبال کے فلسفہ پر عمل کرتے ہوئے پاکستان کی تخلیق کے لیے دن رات انتہائی محنت کی اور اس کے قیام کو صرف اور صرف دینِ اسلام کے مکمل نفاذ سے منسلک کر دیا۔ یوں یہ تحریک جلد ہی عوامی مقبولیت حاصل کر گئی اور اس نے عوام میں جذبہ حریت پیدا کر دیا۔ مسلمانوں میں دینِ اسلام کے نفاذ کا احساس نمایاں ہونے لگا اور نعرہ ’’پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ!‘‘ ہر جگہ چھا گیا۔

اس بات کو سمجھنے کی اشد ضرورت ہے کہ تصورِ پاکستان کو ملّتِ اسلامیہ سے کیوں منسلک کیا گیا تھا! دراصل کسی ملک کی تخلیق جن جغرافیائی بنیادوں پر ہوتی ہے ان میں سے کسی اعتبار سے بھی اسلامیانِ پاکستان ایک قوم کی تعریف پر پورے نہیں اُترتے تھے۔ کہیں بھی زبان‘ ثقافت‘ رسم و رواج کی مماثلت نہیں تھی۔ اتحاد کی اگر کوئی بنیاد تھی تو وہ صرف اور صرف دینِ اسلام تھا۔

اللہ تعالیٰ نے اس جِدّوجُہد کو کامیابی سے ہم کنار کیا اور آخر کار ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو دنیا کے نقشے پر مملکت پاکستان کا ظہور ہوا۔ اس جِدّوجُہد میں لاکھوں مسلمانوں نے اپنی جان‘ عزت اور جائیداد کی قربانی دی۔ اس موقع پر جو ہجرت ہوئی وہ تاریخِ انسانی میں اپنی مثال آپ ہے۔ اسے ’’ہجرتِ مدینہ الثانیہ‘‘ کا نام بھی دیا گیا کیونکہ یہ پاکستان میں دینِ اسلام کے قیام کے لیے ہوئی تھی۔ اس حوالے سے ہزاروں واقعات ہماری قومی تاریخ کا ناقابلِ فراموش حصہ ہیں۔

آج کی نسل شاید علامہ محمد اسد کے نام سے بھی واقف نہیں ہے‘ جن کو بانیٔ قوم نے پاکستان

بننے کے بعد پاکستانی شہریت دی۔ قائد نے انہیں پاکستان کا سیاسی‘ معاشرتی‘ معاشی اور تعلیمی نظام تیار کرنے کا کام سونپا تھا۔ انہیں اس مقصد کے لیے قائم کردہ ’’محکمہ اسلامی تعمیرِ نو‘‘ کا ڈائریکٹر مقرر کیا گیا۔ پیدائشی طور پر وہ یہودی تھے‘ لیکن بعد میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ ۱۹۳۲ء میں ہندوستان کے دورے کے دوران علامہ اقبال سے ان کی ملاقات ہوئی‘ جنہوں نے ان کو اس بات پر راضی کیا کہ وہ مشرق کی طرف اپنا سفر ملتوی کر دیں اور علامہ اقبال کے ساتھ فکرِ اسلامی کی تعمیرِ نو کا کام کریں۔ بعد ازاں انہوں نے فیصلہ کیا کہ نئی وجود میں آنے والی اسلامی ریاست پاکستان کو اپنا مسکن بنا کر اپنی صلاحیتوں سے اس ریاست کے فکری احاطے اور نظام کو واضح کرنے میں مدد کریں۔

قیامِ پاکستان کے بعد علامہ اسد نے انتہائی محنت اور لگن سے اس کام کو تکمیل تک پہنچانے کا فریضہ انجام دیا۔ انہوں نے اپنا کام عقیدت کے ساتھ کیا اور بہت سارے معاملات حکومت کی منظوری اور عمل درآمد کے لیے تیار تھے۔ ریڈیو پاکستان سے نشر شدہ ان کی روزانہ تقاریر اب بھی آرکائیوز میں دستیاب ہیں۔ بدقسمتی یہ ہوئی کہ قائداعظم وفات پا گئے اور علامہ اسد کی سفارشات پر عمل درآمد نہیں ہو سکا۔ سول/ملٹری بیوروکریسی کی اکثریت اپنے برطانوی آقاؤں کے ساتھ وفادار تھی اور انہوں نے پہلے دن ہی سے راہ راست میں رکاوٹیں پیدا کیں۔ آخر کار ’’محکمہ اسلامی تعمیرِ نو‘‘ کو ختم کر دیا گیا۔ یوں علامہ محمد اسد کی ساری محنت فائلوں میں بند ہو کر رہ گئی۔ اس صورتِ حال سے مایوس ہو کر وہ سعودی عرب چلے گئے اور اہم کتابیں لکھیں جن میں ’’The Road to Makkah‘‘ اور ’’The Message of the Quran‘‘ شامل ہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد نئے ملک کی بقا بھی ایک اہم مسئلہ تھا جس کے لیے بڑی جدّوجُہد کی گئی۔ تقسیم کے وقت زیادہ تر وسائل ہندوستان نے روک رکھے تھے۔ قائداعظم قیامِ پاکستان کے صرف ایک سال بعد فوت ہو گئے۔ پاکستان کے حصے میں جو بھی سول اور ملٹری بیوروکریسی آئی‘ پاکستان یا اسلام سے انہیں کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ ان کا واحد مقصد ریاست کے کمزور نظام کو اپنے قابو میں لانا اور حکومت پر اپنا اقتدار قائم کرنا تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد کے واقعات اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ وہ کس طرح اقتدار کے ایوانوں میں داخل ہوئے اور آخر کار ۱۹۵۸ء میں فوجی اداروں کے ذریعہ مطلق اختیارات حاصل کر لیے۔ المیہ یہ ہے کہ قیامِ پاکستان میں کلیدی کردار ادا کرنے والے اکابرین کو کنارے لگا دیا گیا۔ یوں آہستہ آہستہ تمام ریاستی امور پر لالچی اور مفاد پرست عناصر کا مکمل غلبہ ہو گیا۔

یہ تاریخ کا ایک اہم موڑ تھا۔ ہم سب اللہ کے ساتھ کیے گئے اپنے وعدوں کو مکمل طور پر بھول گئے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ اللہ کی نافرمانی بڑھتی گئی اور ہم بحیثیت قوم شرک‘ سود‘ انسانی استحصال پر مبنی نظام کو مضبوط بنانے میں لگ گئے۔ قیامِ پاکستان کے بنیادی مقصد یعنی دینِ اسلام کے نفاذ کو مکمل طور پر بھلا دیا گیا۔ اس طرح ہم اللہ کے عذاب کے مستحق قرار پائے۔

اللہ تعالیٰ نے سزا کے طور پر ہمیں زبان‘ فرقے‘ سماجی اور علاقائی حدود کی بنیاد پر تقسیم کر دیا‘ جس میں وقت کے ساتھ اضافہ ہوتا رہا۔ تا آنکہ ۱۹۷۱ء میں ایک بڑی شکست دے کر اور اس ملک کو دو حصوں میں توڑ کر متنبہ کیا گیا کہ ہم اللہ کے عذاب سے بچنے کی ترکیب کریں اور اس سے کیے گئے وعدے کو مکمل کریں۔ بدقسمتی سے ہم نے آج تک ۱۹۷۱ء کی شکست سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا اور اللہ کی نافرمانی جاری رکھے ہوئے ہیں۔

آج صرف پاکستان ہی نہیں بلکہ پوری مسلم دنیا غلامی کی سی زندگی گزار رہی ہے۔ وہ اسلام کے دشمنوں کی محض کٹھ پتلی بن گئی ہے۔ باوجود اس امر کے کہ اللہ نے مسلمانوں کو نہایت قیمتی وسائل اور دولت سے نوازا ہے‘ دنیا ان کو کسی معاملے میں اہمیت نہیں دیتی۔ مسلمانوں پر کفار کا ظلم وستم عروج پر ہے مگر کوئی قابلِ ذکر ردِعمل ظاہر نہیں ہوتا۔ ہر آنے والا دن دنیا کے معاملات میں مسلمانوں کی ناکامیوں کو ظاہر کرتا ہے۔ اس دنیا میں ہماری بقا اور کامیابی کا واحد راستہ اب یہی رہ گیا ہے کہ اللہ سے خلوصِ دل کے ساتھ معافی مانگیں‘ اپنی تخلیق کے اصل مقصد کی طرف لوٹیں اور پاکستان میں دینِ اسلام کے نفاذ کے لیے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں۔

نبی آخرالزماں حضرت محمد ﷺ نے عالمی سطح پر اسلام کے نفاذ کے لیے عملی اقدامات اور جدّوجُہد کی بشارت دی تھی۔ یہ سارا لائحہ عمل سُنّتِ رسول ﷺ کی شکل میں ہمیشہ کے لیے ہماری رہنمائی کا ذریعہ ہے۔ اس عمل کے بنیادی اجزاء یہ ہیں:

i) دعوتِ اسلام بذریعہ قرآن

ii) حزبُ اللہ (اللہ کی جماعت) کی تلاش اور اس کا حصہ بننا

iii) نظامِ باطل کے خلاف اقامتِ دین کی جدّوجُہد

اللہ کے دین کے نفاذ کی جدّوجُہد کر کے ہم اپنی ہی عاقبت کو سنواریں گے‘ کسی پر احسان نہیں کریں گے۔ قیامت کے روز ہر مسلمان کو اس کے حالات‘ معاملات اور وسائل وصلاحیتوں کے پیمانے پر پرکھا جائے گا‘ جو کہ عین عدل ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دین اسلام کے نفاذ کی جدّوجُہد میں اپنا کردار ادا کرنے کی توفیق‘ طاقت اور ہمت عطا فرمائے۔ آمین! ❁❁❁

مدیر ''مفاہیم'' کی چند فکری غلط فہمیاں

مولانا خان بہادر☆

مدیر ماہنامہ ''مفاہیم'' کراچی نے اکتوبر ۲۰۲۳ء کے شمارے کے اداریہ بعنوان ''عسکریت پسندی اور بعض فکری مسائل'' میں چند اہم سوال اٹھائے ہیں۔ انہوں نے پاکستان میں دہشت گردی کے مسائل کی وجوہات اور اسباب کو بیان کرتے ہوئے ایک سبب یہ بھی بتایا ہے کہ ''اس مسئلے میں ہماری تعبیرات کی کوتاہیوں کو بھی دخل ہے۔''

مدیر محترم نے اس مضمون میں کسی شخصیت یا جماعت کا نام تو نہیں لیا لیکن جو اعتراضات وارد کیے ہیں وہ تنظیم اسلامی اور اس کے بانی محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کی فکر کے حوالے ہی سے ہیں۔ موصوف نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے جو اندازِ تنقید اختیار کیا ہے' اُن سے اس کی توقع نہیں تھی' اِس لیے کہ موصوف ایک عرصۂ دراز تنظیم میں رہ کر گئے ہیں اور ہماری فکر سے خوب اچھی طرح واقف ہیں۔ انہوں نے اِس ناقدانہ تحریر کے ذریعے قارئین کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ ہمارے دینی تصورات اسلاف کے دینی تصوّرات سے مختلف ہیں۔ اس لیے ہم نے مناسب سمجھا کہ ان کی فکری غلط فہمیوں کو احسن اور علمی انداز میں دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ السعي منا والاتمام من اللہ۔

دراصل محدثین کرام اور فقہاء رحمہم اللہ محدثانہ اور فلسفیانہ انداز میں جو اصطلاحات استعمال کرتے ہیں ان کا ایک خاص پس منظر ہوتا ہے۔ ہمارے فقہاء کرام رحمہم اللہ خاص طور پر قانونی انداز میں بات کرتے ہیں جبکہ ایک داعی یا واعظ کا انداز قانونی نہیں ہوتا بلکہ وہ لوگوں کو نصیحت کرتا ہے' عمل کرنے پر ابھارتا ہے' آخرت میں عذاب سے خبردار کرتا ہے۔ خاص طور پر ایک داعیٔ قرآن تو قرآن کے ذریعے ہی لوگوں کی تربیت کرتا ہے۔ مثلاً ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ ایک عظیم عبقری شخصیت' صاحب بصیرت اور داعیٔ قرآن تھے' ساری عمر لوگوں کو قرآن کی طرف آنے کی دعوت دیتے رہے۔ انہوں نے جہاد' اقامتِ دین اور عبادتِ رب جیسی اصطلاحات کو داعیانہ انداز میں

☆معاون مرکزی شعبہ تعلیم وتربیت' تنظیم اسلامی

بیان کیا ہے نہ کہ قانونی انداز میں۔ یہ انداز صرف ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ نے ہی اختیار نہیں کیا بلکہ ہمارے اسلاف بھی یہی انداز اختیار کرتے رہے ہیں۔

مدیر محترم کو جو چند فکری غلط فہمیاں لاحق ہیں' وہ یہ ہیں:

غلط فہمی (۱)

فقیہانہ اور داعیانہ انداز میں فرق نہ کرنے کی وجہ سے ہی مدیر محترم کو خلطِ مبحث ہوا۔

پہلی مثال کے طور پر ہم علامہ ابن قیم رحمہ اللہ کو لیتے ہیں۔ انہوں نے ''زادُ المعاد'' میں جہاد فی سبیلِ اللہ کے حوالے سے بحث کی ہے اور جہاد کی مختلف اقسام بیان کی ہیں۔ وہ اس فصل کا عنوان ہی یہ قائم کرتے ہیں کہ اسلام کے آغاز میں جہاد کا تصوّر کیا تھا۔

اسلاف کی نظر میں جہاد

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ کہتے ہیں:

جب یہ معلوم ہو گیا تو پھر جہاد کی چار اقسام اور مراتب و درجات ہیں: جہاد بالنّفس' شیطان کے خلاف جہاد' کفار کے خلاف جہاد' اور منافقین کے خلاف جہاد۔

۞ جہاد بالنفس کے چار درجات اور مراتب ہیں:

پہلا مرتبہ: ہدایت و راہنمائی کی تعلیم اور دینِ حق کے حصول کے لیے نفس کے خلاف جہاد کیا جائے۔ اس کے بغیر نہ تو دنیا میں سعادت حاصل ہوتی ہے اور نہ ہی آخرت میں کامیابی وفلاح سے ہم کنار ہوا جا سکتا ہے۔ جب اس پر عمل نہ کیا جائے تو دونوں جہانوں میں شقاوت و بدبختی حاصل ہوتی ہے۔

دوسرا مرتبہ: علم کے حصول کے بعد وہ اس پر عمل کرنے کے لیے جہاد اور کوشش کرے' کیونکہ عمل کے بغیر صرف علم اگر اسے نقصان نہ دے تو اسے کوئی فائدہ بھی نہیں دے سکتا۔

تیسرا مرتبہ: وہ اس علم کو آگے پھیلانے اور جنہیں اس کا علم نہیں' انہیں تعلیم دینے میں جہاد اور کوشش کرے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو وہ ان لوگوں میں شامل ہو گا جو اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ ہدایت وراہنمائی اور واضح دلائل کو چھپاتے ہیں۔ یہ علم اسے نہ تو اللہ کے عذاب سے نجات دے گا اور نہ ہی اسے کوئی نفع دے سکتا ہے۔

چوتھا مرتبہ: اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت دینے میں جو تکالیف اور مشکلات پیش آئیں' اور لوگوں کی جانب سے حاصل ہونے والی اذیت پر صبر کرنے کا جہاد' ان سب کو وہ اللہ کے لیے برداشت کرے۔

جب وہ یہ چار مرتبے مکمل کرلے گا تو ربّانیین میں شامل ہو جائے گا۔ سلف رحمہم اللہ کا اس پر اتفاق ہے کہ عالم اس وقت تک ربانی کے نام سے موسوم ہونے کا مستحق نہیں جب تک وہ حق کی پہچان کر کے اس پر عمل کرنے کے بعد لوگوں کو اس کی تعلیم نہ دے۔ جو شخص علم حاصل کرے اور اس پر عمل کر کے لوگوں کو اس کی تعلیم بھی دے تو یہی شخص ہے جو آسمان میں عظیم شان رکھتا ہے۔

۞ شیطان کے خلاف جہاد کے دو مرتبے ہیں:

پہلا مرتبہ: شیطان کی جانب سے بندے کو ایمان میں پیدا ہونے والے شکوک وشبہات دور کرنے کے لیے جہاد کرنا۔

دوسرا مرتبہ: شیطان کی جانب سے فاسد قسم کے ارادے اور شہوات دور کرنے کی کوشش اور جہاد کرنا۔ پہلے جہاد کے بعد یقین اور دوسرے کے بعد صبر حاصل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ڛ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ ۲۴﴾

(السجدۃ)

’’اور جب ان لوگوں نے صبر کیا تو ہم نے ان میں سے ایسے پیشوا اور امام بنا دیے جو ہمارے حکم سے لوگوں کو ہدایت کرتے تھے‘ اور وہ ہماری آیتوں پر یقین رکھتے تھے۔‘‘

یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے خبر دی ہے کہ امامتِ دین صبر اور یقین کے ساتھ حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ صبر شہوات اور فاسد قسم کے ارادوں کو دور اور ختم کرتا ہے‘ اور یقین شکوک وشبہات کو ختم کرتا ہے۔

۞ کُفّار اور منافقین کے خلاف جہاد کے چار مراتب ہیں:

دل‘ زبان‘ مال اور نفس کے ساتھ۔ ہاتھ کے ساتھ جہاد کرنا کفار کے خلاف خاص ہے۔ منافقین کے خلاف زبان کے ساتھ جہاد کرنا خاص ہے۔

۞ ظلم وستم اور بدعات ومنکرات کے خلاف جہاد کے تین مراتب ہیں:

اگر قدرت واستطاعت ہو تو ہاتھ کے ساتھ‘ اور اگر استطاعت نہ ہو تو یہ منتقل ہو کر زبان کے ساتھ‘ اور اگر اس کی بھی استطاعت اور قدرت نہ ہو تو پھر دل کے ساتھ جہاد کرنے میں منتقل ہو جاتا ہے۔ تو جہاد کے یہ تین مراتب ہیں۔

حدیث: ’’جو شخص بغیر جہاد کیے مر گیا اور نہ ہی اس کے نفس میں جہاد کرنے کی خواہش پیدا ہوئی تو وہ نفاق کی ایک علامت پر مرا۔‘‘ (صحیح مسلم)

نوٹ: علامہ ابنِ قیم رحمہ اللہ نے اس موضوع پر طویل بحث کی ہے‘ ہم نے یہاں مختصراً اس کا ذکر کیا ہے۔

مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ اپنی تفسیر ’’معارف القرآن‘‘ میں سورۃ الفرقان کی آیت ۵۲ کے ضمن میں فرماتے ہیں: ’’جہاد بالقرآن یعنی قرآن کی دعوت کو پھیلانا جہاد کبیر ہے۔ ﴿وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا﴾ یہ آیت مکی ہے جبکہ کفار سے قتال وجنگ کے احکام نازل نہیں ہوئے تھے اس لیے یہاں جہاد کو بِہٖ کے ساتھ مقید کیا گیا ہے۔ بِہٖ کی ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے۔ معنی آیت کے یہ ہیں کہ قرآن کے ذریعے مخالفینِ اسلام سے جہاد کرو بڑا جہاد۔ قرآن کے ذریعے اس جہاد کا حاصل اس کے احکام کی تبلیغ اور خلقِ خدا کو اس کی طرف توجہ دینے کی ہر کوشش ہے خواہ زبان سے ہو یا قلم سے یا دوسرے طریقوں سے۔ اس سب کو یہاں جہادِ کبیر فرمایا گیا ہے۔‘‘

مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ سورۃ العنکبوت کی آخری آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ’’جہاد کے اصلی معنی دین میں پیش آنے والی رکاوٹوں کو دور کرنے میں اپنی پوری توانائی صرف کرنے کے ہیں۔ اس میں وہ رکاوٹیں بھی داخل ہیں جو کفار وفجار کی طرف سے پیش آتی ہیں۔ کفار سے جنگ و مقاتلہ اس کی اعلیٰ فرد ہے اور وہ رکاوٹیں بھی داخل ہیں جو اپنے نفس اور شیطان کی طرف سے پیش آتی ہیں۔ جہاد کی ان دونوں قسموں پر اس آیت میں یہ وعدہ ہے کہ ہم جہاد کرنے والوں کو اپنے راستوں کی ہدایت کر دیتے ہیں‘ یعنی جن مواقع میں خیر وشر یا حق وباطل یا نفع وضرر میں التباس ہوتا ہے‘ عقل مند انسان سوچتا ہے کہ کس راہ کو اختیار کروں۔ ایسے مواقع میں اللہ تعالیٰ اپنی راہ میں جہاد کرنے والوں کو صحیح‘ سیدھی‘ بے خطر راہ بتا دیتے ہیں۔ یعنی ان کے قلوب کو اسی طرف پھیر دیتے ہیں جس میں ان کے لیے خیر وبرکت ہو۔‘‘

مولانا صوفی عبدالحمید سواتی صاحب رحمہ اللہ اپنی تفسیر ’’معالم العرفان‘‘ میں سورۃ الفرقان کی آیت ۵۲ کے حوالے سے فرماتے ہیں: ’’جہاد اپنے اندر وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ اس سے مراد محض جنگ نہیں بلکہ جنگ بھی جہاد کا ایک حصہ ہے۔ جہاد سے مراد اپنی تمام ظاہری اور باطنی قوتوں کو دشمن کے مقابلے میں صرف کرنا ہے...... مطلب یہ کہ جہاد صرف قتال کا نام نہیں بلکہ زبان کے ذریعے فریضۂ تبلیغ ادا کرنا‘ دین کے احکام لوگوں تک پہنچانا‘ لوگوں کے شکوک وشبہات دور کرنا‘ بوقت ضرورت بحث مباحثہ کرنا‘ تصنیف وتالیف کے ذریعے لوگوں تک علم پہنچانا‘ مال خرچ کرنا سب جہاد میں آتا ہے مگر قرآن کی تبلیغ کو اللہ نے جہاد کبیر سے موسوم کیا ہے۔‘‘ پھر شاہ عبدالعزیز دہلوی ؒ کا قول نقل فرماتے ہیں کہ ’’دشمن کے مقابلے میں ظاہری‘ باطنی‘ مالی اور جانی قُویٰ کو صرف کرنا جہاد کا ایک حصہ ہے ......‘‘ آگے لکھتے ہیں: ’’دین کے چار مسلّمہ دشمن ہیں جن کا مقابلہ کرنے کے لیے قرآن نے تعلیم دی ہے۔ سب سے پہلا دشمن دین خود نفسِ انسانی ہے۔ دوسرا دشمن شیطان ہے۔

تیسرا دشمن کافر ہے۔ چوتھا دشمن منافق ہے۔ بہرحال ان چاروں دشمنانِ دین کا مقابلہ کرنا ضروری ہے۔ دشمن کے خلاف جہاد تو وقتی طور پر ہوتا ہے جو بالآخر ختم ہو جاتا ہے مگر قرآن کے ذریعے جس جہاد کا حکم دیا گیا وہ مسلسل اور دائمی ہے۔ جب تک پوری دنیا کفر‘ شرک‘ بدعت اور معاصی سے پاک نہ ہو جائے‘ جب تک لوگوں کی فکر پاک نہ ہو جائے‘ جب تک ظلم و ناانصافی کا خاتمہ نہ ہو جائے یہ جہاد جاری رہے گا۔‘‘

نوٹ: اس طرح کے بہت سے حوالہ جات دیے جا سکتے ہیں لیکن طوالت کے خوف سے اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

غلط فہمی (۲)

مدیرِ محترم کو جو دوسری بات بہت گراں گزری ہے وہ یہ کہ ’’ہماری اصطلاحات کے مفاہیم محدود بھی ہو گئے اور مسخ بھی۔‘‘

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے اسلاف نے جہاد کی اصطلاح کو جس طرح استعمال کیا وہ وسیع تر مفہوم آج محدود بھی ہو گیا ہے اور مسخ بھی۔ اسی کا شاخسانہ ہے کہ مدیرِ محترم جہاد کو صرف قتال تک محدود سمجھ رہے ہیں اور جہاد کا مطلب صرف لڑائی ہی سمجھ رہے ہیں۔ اللہ کے دین کے غلبے کے لیے پچھلی ساری جدّ و جُہد کو جہاد سے باہر قرار دے رہے ہیں‘ جبکہ ہمارے اسلاف نے جہاد کی اصطلاح کو جس طرح استعمال کیا ان کی عبارات ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔

غلط فہمی (۳)

موصوف لکھتے ہیں: ’’جہاد کا غالب استعمال کُفّار کے خلاف ہے نہ کہ مسلمانوں کے خلاف۔‘‘

موصوف نے کشاف اصطلاحات الفنون کے حوالے سے جو جہاد کی تعریف کی ہے (کہ جہاد کا غالب استعمال کفار کے خلاف ہے) اس سے غلط مطلب اخذ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر اس میں ہی موصوف ذرا دقّتِ نظر سے دیکھ لیتے تو بات بالکل واضح تھی کہ شریعت میں جہاد کا ’’غالب‘‘ استعمال تو کفار ہی کے خلاف ہے‘ لیکن اس میں مسلمانوں کے خلاف جہاد کی نفی کیسے ثابت ہو گئی؟ ایک مسلمان معاشرے میں جہاں اللہ کا دین غالب نہ ہو‘ اس میں دین کے غلبے کے لیے جو جِدّ و جُہد کی جائے گی کیا اس پر جہاد فی سبیل اللہ کا اطلاق نہیں ہوتا؟ اگر حضرت حسین ؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیر ؓ اسلام کے صرف سیاسی نظام میں بگاڑ کے خلاف تلوار اٹھائیں اور وہ جہاد فی سبیل اللہ کہلائے اور ایک ایسا معاشرہ جس میں نہ سیاسی نظام اسلامی ہو‘ نہ معاشرتی‘ نہ معاشی‘ بلکہ

پورے کا پورا نظام ہی طاغوتی ہو‘ وہاں اگر اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے پُرامن منظم احتجاجی تحریک کے ذریعے اسلام کو غالب کرنے کی کوشش کی جائے تو آخر وہ کیوں نہ جہاد فی سبیل اللہ کہلائے گی؟

غلط فہمی (۴)

موصوف لکھتے ہیں: ’’ہماری روایت میں مسلمانوں کے خلاف جہاد کا کوئی تصور پایا جاتا ہے اور نہ جواز۔‘‘

سوال یہ ہے کہ کیا حضرت حسین ؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیر ؓ ہماری روایت سے ہٹ کر تھے‘ معاذ اللہ؟ بلکہ وہاں ہی سے تو ہماری روایت شروع ہوتی ہے۔ اسی طرح ابن اشعث ؒ کا حجاج کے خلاف خروج جس میں ان کے ساتھ تابعینؒ‘ علماء اور قرّاء کی ایک بہت بڑی جماعت شامل تھی۔ اسی طرح نفس زکیہ محمد بن عبداللہؒ اور ابراہیم بن عبداللہؒ کا ابوجعفر منصور کے خلاف خروج وغیرہ اور دو جلیل القدر شخصیات امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کا ان دونوں کا ساتھ دینا۔ سوال یہ ہے کہ کیا ان تمام حضرات کے خروج کو جہاد کا نام نہیں دیا جا سکتا؟ یہ بات یاد رہنی چاہیے کہ خروج بھی جہاد فی سبیل اللہ ہی ہوتا ہے‘ البتہ کُفّار کے خلاف جہاد اور مسلمانوں کے خلاف جہاد میں فرق کرنے کے لیے اس کو خروج کا نام دیا جاتا ہے۔ پس یہ کہنا کہ ’’ہماری روایت میں مسلمانوں کے خلاف جہاد کا کوئی تصوّر پایا جاتا ہے نہ جواز‘‘ حقیقت سے بالکل بہت دور کی بات ہے۔ اگر ان کی اس بات کو مِن وعَن مان لیا جائے تو پھر اس سے یہ ماننا بھی لازم آئے گا کہ ہمارے اصل ہیرو تو حجاج بن یوسف‘ یزید اور ابوجعفر منصور وغیرہ ہیں‘ جبکہ حضرت حسین ؓ‘ حضرت عبداللہ بن زبیر ؓ‘ ابن اشعث رحمہ اللہ‘ نفس زکیہ رحمہ اللہ اور ابراہیم رحمہ اللہ تو‘ معاذ اللہ‘ باغی اور واجب القتل ٹھہرے کیونکہ ان کے بقول انہوں نے مسلمان حکمرانوں کے خلاف خروج کیا۔

غلط فہمی (۵)

موصوف نے یہ بھی لکھا کہ ’’مسلمانوں کے مابین کام کرنے والوں کے لیے دعوت وتزکیہ‘ امر بالمعروف ونہی عن المنکر وغیرہ کی اصطلاحات موجود تھیں لیکن انہی کاموں کے لیے اب جہاد کی اصطلاح اس کی فرضیت کے اعلان کے ساتھ استعمال ہونے لگی۔‘‘

سوال یہ ہے کہ کیا یہ کام صرف آج کے داعیانِ قرآن ہی نے کیا ہے یا ہمارے باقی اسلاف کا بھی یہی انداز تھا؟ ہم جہاد فی سبیل اللہ کے حوالے سے اوپر اپنے اسلاف کے اقوال ذکر کر چکے ہیں اور یہ بات موصوف بھی بخوبی جانتے ہیں کہ جہاد فی سبیل اللہ ایک جامع اصطلاح ہے اور اس

اصطلاح کے اندر ہی دعوت اور تزکیہ کا مفہوم بھی ہے‘ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا مفہوم بھی ہے۔خود موصوف نے جہاد کی جس تعریف کا ذکر اپنے اداریہ میں کیا‘ اس کے اندر بھی اگر دیکھیں تو کفار کے ساتھ قتال سے پہلے دعوتِ دین کا ذکر ہے اور اسی بات کو موجودہ دور کے داعیانِ قرآن اور ماضی کے ہمارے اسلاف نے مختلف انداز میں سمجھانے کے لیے جہاد کے ذیل میں بیان کیا ہے۔ باقی رہا جہاد کی فرضیت کا سوال تو اس کا الزام بھی اسلاف کو دیجیے جنہوں نے اس کی فرضیت کو یوں لکھا:

آٹھویں صدی ہجری کے محدث اور فقیہ امام ابن قیم رحمہ اللہ اپنی مایہ ناز تصنیف ’’زاد المعاد‘‘ میں فرماتے ہیں:

وَالتَّحْقِيقُ أَنَّ جِنْسَ الْجِهَادِ فَرْضُ عَيْنٍ إِمَّا بِالْقَلْبِ، وَإِمَّا بِاللِّسَانِ، وَإِمَّا بِالْمَالِ، وَإِمَّا بِالْيَدِ‘ فَعَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ أَنْ يُجَاهِدَ بِنَوْعٍ مِنْ هٰذِهِ الْأَنْوَاعِ.أَمَّا الْجِهَادُ بِالنَّفْسِ فَفَرْضُ كِفَايَةٍ، وَأَمَّا الْجِهَادُ بِالْمَالِ فَفِي وُجُوبِهِ قَوْلَانِ: وَالصَّحِيحُ وُجُوبُهُ، لِأَنَّ الْأَمْرَ بِالْجِهَادِ بِهِ وَبِالنَّفْسِ فِي الْقُرْآنِ سَوَاءٌ، وَعَلَّقَ النَّجَاةَ مِنَ النَّارِ بِهِ وَمَغْفِرَةَ الذَّنْبِ وَدُخُولَ الْجَنَّةِ

’’لیکن تحقیق یہ ہے کہ جنسِ جہاد فرضِ عین ہے‘ خواہ دل سے ہو یا زبان سے یا ہاتھ سے یا مال سے‘ اس لیے تمام مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ ان میں سے کسی بھی قسم کا جہاد کریں۔ لیکن جہاد بالنفس فرضِ کفایہ ہے‘ اور جہاد بالمال کے بارے میں دو قول ہیں‘ جن میں سے صحیح وجوب والا قول ہے‘ کیونکہ قرآن میں جہاد بالمال اور جہاد بالنفس کا حکم یکساں طور پر دیا گیا ہے اور جہنم سے نجات و مغفرت اور جنت میں داخلہ کو اس پر موقوف قرار دیا گیا ہے۔‘‘

غلط فہمی (۶)

موصوف لکھتے ہیں: ’’قتال کو کافروں کے بجائے باطل قوتوں اور اقامتِ دین کی راہ میں رکاوٹ بننے والے مراعات یافتہ طبقے کے خلاف ’’تصادم‘‘ کے آخری مرحلے کے طور پر بیان کیا گیا تو اب اس میں مسلم وغیر مسلم کی تمیز بھی جاتی رہی۔‘‘

گویا مدیر محترم بالفاظ دیگر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر دین کی راہ میں رکاوٹ بننے والے کافر نہ ہوں‘ بلکہ مسلمان ہوں تو پھر مسلمانوں کے خلاف کوشش نہیں کی جاسکتی‘ حالانکہ قتال کی علّت کافروں کو قتل کرنا نہیں ہے بلکہ اللہ کے دین کا غلبہ اور ظلم و فتنے کا خاتمہ ہے۔ آخر یہ کہاں سے ثابت ہوگیا کہ اگر کافر دین کے راستے میں رکاوٹ بنیں تو ان کے ساتھ تو قتال کیا جائے اور مسلمان اگر اس راستے

میں رکاوٹ بنیں تو ان کے ساتھ قتال جائز نہیں ہے؟ حضرت حسین ؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیر ؓ نے جو تلوار اٹھائی اس کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟ اسی طرح پچھلی صدی کے آخر میں امارتِ اسلامیہ افغانستان کی طرف سے احمد شاہ مسعود اور دیگر باغیوں کے خلاف کیے جانے والے جہاد کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے جس کی ہر مکتبِ فکر کے علماء نے تائید کی؟ ظاہر ہے وہ بھی تو مسلمانوں ہی کے خلاف تھا۔

غلط فہمی (۷)

موصوف لکھتے ہیں: ’’قوت کے ساتھ نہی عن المنکر کی ایک اجتہادی صورت جلسے جلوس و احتجاج کو یک طرفہ قتال کا نام دیا گیا۔‘‘

اس صورت کو یک طرفہ قتال کا نام دینے میں آخر کون سے شرعی حکم کی خلاف ورزی ہوگئی؟ یہ تو صرف بات سمجھانے کے لیے کہا گیا۔ یا موصوف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جہاد صرف اسی وقت ہوگا جب قتل وقتال ہی ہو‘ جب لازماً کسی کی جان ہی لی جائے؟ حالانکہ یہ بات سمجھنے کی ہے کہ جب ہم پاکستان کے تناظر میں قتال کی بات کرتے ہیں تو یہاں ہم لڑائی کے طور پر یہ لفظ استعمال نہیں کر رہے ہوتے بلکہ یہاں ہم جہاد کے آخری مرحلے کے طور پر اس کو بیان کر رہے ہوتے ہیں اور اس کی عملی صورت یہ ہوگی کہ یک طرفہ طور پر ہم اپنے آپ کو قربان کرنے کے لیے پیش کریں گے جبکہ کسی دوسرے مسلمان کی جان ہم نہیں لیں گے۔

غلط فہمی (۸)

ایک اور پھبتی مدیر محترم ان الفاظ میں کستے ہیں: ’’اس سرخ خاکے میں مزید رنگ کا اضافہ تب ہوا جب خروج کو بھی داخلِ بحث کیا گیا۔‘‘

مزید لکھتے ہیں کہ: ’’جمہور علماءِ اسلام کے ہاں خروج کے عدمِ جواز کے باوجود فقہ حنفی کا خروج کے جواز کا قول اس وضاحت کے ساتھ عام کیا جاتا رہا کہ یہ جواز شرائط کے ساتھ مشروط ہے۔‘‘

مدیر محترم کا مطلقاً یہ کہنا کہ جمہور علماء اسلام کے ہاں خروج جائز نہیں‘ حقیقت کے خلاف ہے‘ اس لیے کہ فقہاء نے ظالم و فاسق اور کفرِ صریح اور ترکِ نماز کے مرتکب مسلمان حکمران کے خلاف خروج کے حکم کو الگ الگ بیان کیا ہے۔ اگرچہ ظالم و فاسق مسلمان حکمران کے خلاف خروج کے حوالے سے جمہور فقہاء عدمِ جواز کے قائل ہیں لیکن کچھ فقہاء جیسے کہ امام ابوحنیفہ ؒ وغیرہ اس کے جواز کے بھی قائل ہیں‘ جیسا کہ احکام القرآن میں امام جصاص ؒ نے اس کی وضاحت کی ہے۔

البتہ کفرِ صریح اور بعض کے نزدیک ترکِ نماز کے مرتکب مسلمان حکمران کے خلاف خروج کے جواز پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے لیکن یہ جواز شرائط کے ساتھ مشروط ہے۔ وہ شرائط ہم آگے ذکر کریں گے۔ وہ اگر پائی جائیں تو یہ خروج سب کے نزدیک جائز ہے' البتہ کفرِ صریح کے ثبوت کے حوالے سے بھی مختلف شرائط ہیں۔ ان شرائط کا پایا جانا بھی ضروری ہے جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ فقہاءِ کرام کفرِ صریح اور ترکِ نماز کے مرتکب مسلمان حکمران کے خلاف خروج کے جواز کے لیے جن احادیث کا حوالہ دیتے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

دعانا رسولُ اللهِ ﷺ فبايعناه، فكان فيما اخذ علينا أن بايعنا على السمع والطاعه في منشطنا ومكرهنا وعسرنا ويسرنا، واثرة علينا، وان لا ننازع الامر اهله، قال:((الا ان تروا كفرا بواحا عندكم من الله فيه برهان)) (صحيح مسلم، كتاب الامارة)

''ہمیں اللہ کے رسول ﷺ نے پکارا پس ہم نے آپ ﷺ سے بیعت کی۔ پس جن معاملات میں آپ ﷺ نے ہم سے وعدہ لیا اور ہم نے آپ ﷺ سے بیعت کی وہ یہ تھے کہ ہم ہر حال میں سمع وطاعت کریں گے چاہے ہمارے دل آمادہ ہوں یا نہ ہوں' چاہے ہم تنگی میں ہوں یا آسانی میں' اور چاہے ہم پر کسی کو ترجیح دی جائے' اور ہم نے اس معاملے میں آپ ﷺ سے بیعت کی کہ ہم اپنے اُمراء سے ان کی امارت میں جھگڑا نہیں کریں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں سوائے اس کے کہ تم کفرِ صریح دیکھو کہ جس کے بارے میں تمہارے پاس اللہ کے ہاں کوئی روشن دلیل ہو۔''

((انه يستعمل عليكم امراء فتعرفون وتنكرون، فمن كره فقد برئ، ومن انكر فقد سلم، ولكن من رضي وتابع)) قالوا: يا رسول الله الا نقاتلهم؟ قال: ((لَا، مَا صَلَّوا)) (صحيح مسلم كتاب الامارة)

''عنقریب تم پر کچھ حکمران ایسے مسلّط کیے جائیں گے جن کی بعض باتوں کو تم پسند کرو گے اور ان کی بعض باتوں کا انکار کرو گے پس جس نے ان حکمرانوں کے منکرات کو دل سے ناپسند کیا تو وہ بریٔ الذمہ ہے اور جس نے نہی عن المنکر باللسان کیا تو وہ بھی بچ رہا لیکن جو ان حکمرانوں کے منکرات پر راضی ہو گیا اور اس نے ان کی پیروی کی (تو ایسا شخص قابلِ وبال ہے)۔ صحابہ ؓ نے کہا: اللہ کے رسول ﷺ کیا ہم ایسے حکمرانوں سے قتال نہ کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں' جب تک وہ نماز پڑھتے رہیں۔''

((خيار ائمتكم تحبونهم ويحبونكم، ويصلون عليكم وتصلون عليهم، وشرار ائمتكم الذين تبغضونهم ويبغضو نكم، وتلعنونهم ويلعنونكم)) قيل يا رسول الله، افلا ننابذهم بالسيف؟ فقال: ((لا، ما اقاموا فيكم الصلاة)) (صحيح مسلم، كتاب الامارة)

''تمہارے بہترین حکمران وہ ہیں کہ جن سے تم محبت کرتے ہو اور وہ تم سے محبت کرتے ہیں' وہ تمہارے لیے رحمت کی دعا کرتے ہیں اور تم ان کے لیے رحمت کی دعا کرتے ہو۔ اور تمہارے بدترین حکمران وہ ہیں کہ جن سے تم نفرت کرتے ہو اور وہ تم سے نفرت کرتے ہوں' تم ان پر لعنت بھیجتے اور وہ تم پر لعن طعن کرتے ہوں۔'' کہا گیا: اللہ کے رسول ﷺ! کیا ہم ان کو تلوار سے ہٹا نہ دیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں' جب تک وہ تمہارے درمیان نماز قائم کرتے رہیں۔''

ہمارے دیگر بہت سے اسلاف نے بھی اپنی کتابوں کے اندر اس بحث کو بہت تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ مثلاً علامہ ابن عابدین شامی (متوفی ۱۲۵۲ھ) لکھتے ہیں:

واذا قلد عدلا ثم جار وفسق لا ينعزل، ولكن يستحب العزل ان لم يستلزم فتنة۔

''پس اگر تو حالتِ عدل میں اس کو امامت دی گئی اور پھر وہ ظالم و فاسق بن گیا تو خود بخود معزول نہیں ہوگا' لیکن اگر فتنے کا اندیشہ نہ ہو (یعنی اگر پُرامن طریقے سے معزولی ممکن ہو) تو اس کو معزول کرنا مستحب ہے۔''

علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

اذا وقع من السلطان الكفر الصريح فلا تجوز طاعته في ذلك، بل تجب مجاهدته لمن قدر عليها. (فتح الباری، کتاب الفتن)

''جب حاکمِ وقت کفرِ صریح کا ارتکاب کرے تو اس میں اس کی اطاعت جائز نہیں' بلکہ ہر اس آدمی کے لیے اس سے مقابلہ کرنا واجب ہے جو اس پر قدرت رکھتا ہو۔''

ونقل ابن التين عن الداودي قال: الذي عليه العلماء في امراء الجور انه ان قدر على خلعه بغير فتنة ولا ظلم وجب، والا فالواجب الصبر، وعن بعضهم لا يجوز عقد الولاية لفاسق ابتداء، فان احدث جورا بعد ان كان عدلا فاختلفوا في جواز الخروج عليه، والصحيح

المنع الا ان یکفر فیجب الخروج علیه. (فتح الباري، کتاب الفتن، امام ابن حجر عسقلانی رحمه الله)

''امام ابنِ حجر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ابنِ تین نے داؤدی (رحمہما اللہ) سے نقل کیا ہے کہ: ظالم اُمراء کے بارے میں علماء کی رائے یہ ہے کہ اگر بغیر فتنہ اور ظلم کے انہیں ہٹانا ممکن ہو تو ضروری اور واجب ہے، ورنہ صبر واجب ہے۔ بعض نے کہا کہ فاسق کو حکومتی عہدہ دینا ہی جائز نہیں۔ اگر عہدہ حاصل کرنے کے بعد ظلم کیا تو اس کے ہٹانے میں اختلاف ہے، صحیح بات یہ ہے کہ بغاوت منع ہے جب تک کہ اس سے واضح کفر صادر نہ ہو۔''

آج کے دور کے علماء بھی اس مسئلے کو اسی طرح بیان کرتے اور لکھتے ہیں۔ مثلاً مفتی تقی عثمانی صاحب حفظہ اللہ نے اپنی کتاب ''اسلام اور سیاسی نظریات'' میں ''حکومت کی معزولی'' کے عنوان سے اس مسئلے کو بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ اس موضوع پر حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی ؒ نے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جس کا نام ہے ''جزل الکلام فی عزل الامام'' اور اس کا خلاصہ میں نے ''تکملہ فتح الملہم'' میں بھی لکھ دیا ہے۔ مزید آگے چل کر لکھتے ہیں کہ حضرت حکیم الامت ؒ فرماتے ہیں کہ ایک اور صورت ایسی ہے کہ جس میں امیر کا فسق دوسروں تک متعدی ہو رہا ہو یعنی امیر لوگوں کا دین خراب کر رہا ہو، مثلاً لوگوں کو معصیت پر مجبور کر رہا ہو، تو اگر یہ عمل کسی ایک یا دو افراد کے ساتھ ہو تو اس کا حکم اکراہ کا ہوگا اور اکراہ کے احکام جاری ہوں گے۔ لیکن اگر امیر نے اسے ایک مستقل پالیسی بنا لیا کہ وہ مستقل طور سے لوگوں کو معصیتوں پر مجبور کرنے لگا ہے اور اس میں غیر اسلامی قوانین کا مسلسل جاری رکھنا بھی داخل ہے، تو اگر اس کی وجہ یہ ہے کہ ان غیر اسلامی قوانین کو شریعت کے مقابلے میں زیادہ بہتر سمجھتا ہے تو یہ کفر صریح ہے، اور اگر فوقیت نہیں دیتا لیکن تعبیراً (شریعت کی غلط تشریح کر کے) یا تکاسلاً (سستی کی بنا پر) اس کو چھوڑا ہوا ہے تو بھی اگرچہ یہ کفر صریح نہ ہو لیکن کفر کے حکم سے ملحق ہو سکتا ہے کیونکہ اس سے شریعت کا استخفاف لازم آتا ہے۔ اس صورت میں بھی خروج جائز ہے۔ لیکن یہاں دو اہم باتیں یاد رکھنی ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ خاص طور پر اس آخری صورت میں آراء کا اختلاف ہو سکتا ہے کہ آیا امیر کے مسلسل خلافِ شریعت عمل کو کفر بواح کے ساتھ ملحق کیا جا سکتا ہے یا نہیں! چنانچہ یہ ممکن ہے کہ بعض لوگ یہ کہیں کہ اس کے خلاف خروج کرنا چاہیے اور بعض کہیں کہ خروج نہیں کرنا چاہیے۔ ایسا اختلافِ آراء اجتہادی اختلاف ہوگا اور اس میں کوئی جانب قابلِ ملامت نہیں۔ دوسری بات یہ کہ اِس پر تمام حضراتِ فقہاء متفق ہیں کہ خروج جہاں کہیں بھی جائز ہوتا ہے اس کے لیے دو شرطیں ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ

طاقت کے ذریعے حکومت کو ہٹا دینے کی قدرت اور دوسری یہ کہ اس کو ہٹانے میں اور کوئی اس سے بڑا مفسدہ پیش آنے کا اندیشہ نہ ہو۔

اب مدیرِ محترم سے سوال ہے کہ کیا ان سب اسلاف پر بھی یہی الزام ہوگا کہ انہوں نے خروج کا راستہ کھولا ہے؟

خروج کی بات ڈاکٹر اسرار احمد صاحبؒ نے غیر مسلح پُرامن منظم احتجاجی سیاست کے حق میں دلائل دیتے ہوئے اور مسلّح کارروائیوں کے خلاف دلائل دیتے ہوئے اصولی طور پر کہی ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے حوالے سے چند شرائط کے ساتھ خروج کو جائز قرار دینے کی بات ڈاکٹر صاحب نے اپنی طرف سے نہیں کہی بلکہ امام جصاص رحمہ اللہ نے ''احکام القرآن'' میں لَا يَنَالُ عَهۡدِي الظّٰلِمِيۡنَ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھی ہے۔ البتہ یہ بات یاد رہے کہ جس معاشرے میں ہم رہ رہے ہیں اور جن حالات میں اس وقت ہم موجود ہیں، وہاں خروج کا کوئی امکان نہیں۔ پھر اپنی مسلمان افواج کے خلاف یہ انداز اختیار کرنا بالکل درست نہیں ہے۔ لیکن موصوف کی اپنی اصطلاح کے مطابق ''زیادتی'' کی انتہا یہ ہے کہ اس بات کو کچھ سے کچھ بنا کر الٹا داعیانِ قرآن پر ہی دہشت گردی کو ہوا دینے کا الزام لگایا جا رہا ہے۔

غلط فہمی (۹)

موصوف لکھتے ہیں: ''ہم لوگوں کو سنتے رہتے ہیں کہ سورۃ المائدہ کی آیت ''﴿وَمَنۡ لَّمۡ يَحۡكُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ﴾ (کہ جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہی ظالم ہیں) میں وارد لفظ ظالم کی تفسیر اِنَّ الشِّرۡكَ لَظُلۡمٌ عَظِيۡمٌ سے کرتے ہوئے، حکم بغیر ما انزل اللہ کے مرتکبین کو ''صاف مشرک'' قرار دیا جاتا ہے۔''

مؤدبانہ گزارش ہے کہ تنظیم اسلامی نے کبھی بھی مفتیانہ انداز میں فتوے کی زبان میں کسی کو ''صاف'' مشرک نہیں کہا اور نہ ہی فتوے کے انداز میں بات کی ہے۔ قرآن حکیم کے ایسے مقامات پر ایک ترہیب کا انداز اختیار کیا جاتا ہے اور یہاں ہم مسلمانوں کو کبھی بھی اس طرح مشرک قرار نہیں دیتے جس طرح کا کوئی ایک ''صاف'' مشرک ہوتا ہے۔ ہمارا اس بارے جو موقف ہے، موصوف اس سے اچھی طرح واقف بھی ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جس طرح ظلم سے کم ظلم اور کفر سے کم کفر فقہاء اور ہمارے اسلاف نے بیان کیا، اسی انداز میں ہم کہتے ہیں کہ مسلمان تو ہیں لیکن مسلمان جس فعل کا ارتکاب کر رہے ہیں یہ شرک ہی ہے۔ تو کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہمارے اسلاف نے اللہ کی توحید کی جو اقسام بیان کی ہیں، خاص طور پر توحیدِ الوہیت اور توحیدِ عبادت اور ان کے ضمن میں توحید

حاکمیت کو بھی بیان کیا ہے‘ تو کیا اللہ کے نازل کردہ قانون سے ہٹ کر فیصلے کرنا اور طاغوتی نظام کو نافذ کرنا اللہ کی حاکمیت میں شرک نہیں ہے؟ کیا اللہ کی حاکمیت کو چیلنج نہیں کیا گیا؟ کیا اس کو ہمارے اسلاف نے شرک قرار نہیں دیا؟

مثلاً علامہ شنقیطی ﷫ سورۃ الکہف: آیت ۲۶ ﴿لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا﴾ (اللہ تعالیٰ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا) کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

أَنَّ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الْقَوَانِينَ الْوَضْعِيَّةَ الَّتِي شَرَعَهَا الشَّيْطَانُ عَلَى أَلْسِنَةِ أَوْلِيَائِهِ مُخَالَفَةً لِمَا شَرَعَهُ اللهُ جَلَّ وَعَلَا عَلَى أَلْسِنَةِ رُسُلِهِ صَلَّى اللهُ عليهم وَ سَلَّم، أَنَّهُ لَا يَشُكُّ فِي كُفْرِهِمْ وَشِرْكِهِمْ إِلَّا مَنْ طَمَسَ اللهُ بَصِيْرَتَهُ، وَأَعْمَاهُ عَنْ نُورِ الْوَحْيِ مِثْلَهُمْ.

”جو لوگ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کی اتباع کرتے ہیں‘ جو دراصل شیطانی قوانین ہیں جو اس نے اپنے متبعین کے ذریعہ بنوائے ہیں یہ سراسر اللہ کی شریعت کے مخالف ہیں جو اُس نے اپنے رسولوں ﷺ کے ذریعے جاری فرمائی ہے۔ بلاشبہ ان کی تابع داری کرنے والوں کے کفر و شرک میں کوئی شک نہیں۔ اللہ نے ان کی بصارت و بصیرت چھین لی ہے۔ یہ لوگ وحی الٰہی کے نور سے مکمل طور پر محروم ہیں۔“ (اضواء البیان)

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب رحمہ اللہ نے بھی ”بیان القرآن“ میں سورۃ المائدہ کی تفسیر کرتے ہوئے یہی انداز اختیار کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ: ”اگر آپ نے اللہ کے قانون کے ساتھ ساتھ کسی اور قانون کو بھی مان لیا یا اللہ کے قانون کے مقابلے میں کسی اور قانون کو ترجیح دی تو یہ شرک ہے“۔ یہاں شرک کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جسے موصوف ”صاف مشرک“ پڑھ رہے ہیں۔ مدیر محترم شرک اور مشرک کے درمیان فرق نہیں کر رہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ نے سورۃ المائدہ کی آیت ۴۷ کے آخر میں آیت ۴۴‘ ۴۵ اور ۴۷ کے آخری حصے بیان کرنے کے بعد پھر فرمایا ہے کہ ”ان آیاتِ قرآنیہ کو سامنے رکھیے اور ملّتِ اسلامیہ کی موجودہ کیفیت کا جائزہ لیجیے کہ دنیا میں کتنے ممالک ہیں جہاں اللہ کا قانون نافذ ہے؟ آج روئے زمین پر کوئی ایک بھی ملک ایسا نہیں ہے جہاں شریعتِ اسلامی پورے طور پر نافذ ہو اور اسلام کا مکمل نظام قائم ہو۔ اگرچہ ہم انفرادی اعتبار سے مسلمان ہیں لیکن ہمارے نظام کافرانہ ہیں“۔ یہاں بھی مدیرِ محترم فردِ کافر اور کافرانہ نظام میں فرق نہیں کر سکے‘ جبکہ ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ تو واضح انداز میں فرما رہے ہیں کہ ”اگرچہ ہم انفرادی اعتبار سے مسلمان ہیں“ جبکہ مدیر محترم اس مسلمان کے لفظ کو بھی کھینچ تان کر کافر بنانے پر بضد ہیں۔

خلاصۂ کلام

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کی حاکمیت کو جس واضح انداز میں ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے‘ بقول مولانا محمد اسلم شیخوپوری رحمہ اللہ: ”ایک ڈاکٹر نے ہمیں بھولا ہوا سبق یاد دلایا“ تو بجائے اس کے کہ اس کی قدر کی جاتی‘ دین کو قائم کرنے کی جدّ و جُہد کی جاتی اور اپنے ملک کے معروضی حالات کو دیکھتے ہوئے یہاں ایک پُرامن منظم احتجاجی تحریک چلائی جاتی‘ اس کے برعکس اس فکر ہی کو مجروح کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یہ صرف ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کا کہنا ہی نہیں ہے بلکہ ۲۰۱۰ء میں علمائے دیوبند نے جامعہ اشرفیہ میں جو قرارداد پاس کی تھی اس میں بھی یہی طے کیا تھا کہ ہمارے تمام مسائل کا حل شریعت کے نفاذ میں ہے اور اس کے لیے پُرامن منظم احتجاجی تحریک چلانے کی ضرورت ہے۔ اسی بات کو مفتی محمد تقی عثمانی صاحب حفظہ اللہ جوتے کی مثال کے ذریعے بھی بیان کر چکے ہیں۔ لہٰذا دہشت گردی کو اس فکر کے ساتھ جوڑنے کی بجائے چاہیے تو یہ تھا کہ اللہ کے دین کو قائم کرنے کے لیے یہاں پُرامن منظم احتجاجی تحریک چلائی جاتی لیکن اس تحریک کی حمایت کے بجائے الٹا اس تحریک کے بارے میں شکوک و شبہات پھیلانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ فکر کی کجی تو یہ ہے کہ جہاد کو صرف قتال تک محدود رکھ کر نہ صرف یہ کہ اسلاف کی مخالفت کی جاتی ہے بلکہ اس سے ان لوگوں کو بھی یہ غلط فہمی ہوتی ہے جو اقامتِ دین کی جِدّو جُہد کا جذبہ رکھتے ہیں کہ جب جہاد صرف قتال ہی ہے تو پھر ہم تو اللہ کے دین کے غلبے کے لیے صرف قتال ہی کریں گے اور پھر اس کو انہوں نے وہ شکل دی ہے جو آج ہمارے ملک میں جاری ہے۔ اصل میں تو فکر کی کجی اس وجہ سے ہے کہ جہاد کو قتال تک محدود کر دیا گیا‘ ورنہ جس طرح ہمیشہ اسلاف جہاد کا تصوّر بیان کرتے رہے اور خود علمائے دیوبند نے اس کو ۲۰۱۰ء میں ایک اعلامیہ کی صورت میں بیان کیا‘ اس فکر کو عملاً آگے بڑھایا جاتا تو اس دہشت گردی کا جواز ہی ختم ہو جاتا۔ سوال یہ ہے کہ کیا نفاذِ شریعت کے لیے پُرامن منظم احتجاجی تحریک چلانے کا جو اعلامیہ جاری کیا گیا تھا وہ جہاد فی سبیل اللہ کے علاوہ کچھ اور ہوگا؟ کیا اس پر جہاد فی سبیل اللہ کا اطلاق نہیں ہوگا؟ ضرورت تو اس امر کی تھی کہ یہ فکر عام کی جاتی اور جو لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ جہاد تو صرف قتال ہی ہے اور اسی ذریعے سے ہی اس ملک میں دین کو غالب کیا جا سکتا ہے‘ ان کو راہ راست پہ لانے اور ان کی اصلاح کی کوشش کی جاتی۔ یہی کوشش ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کرتے رہے اور آج ہم بھی ڈنکے کی چوٹ پر اسی موقف کو بیان کرتے ہیں‘ باوجود اس کے کہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ قتال جو لڑائی کی صورت میں ہے وہ فی نفسہٖ اپنی شرائط کے ساتھ جائز ہے۔ (باقی صفحہ 64 پر)

Aug 2024
Vol.73

Regd. CPL No.115
No.8

Monthly **Meesaq** Lahore

جاری کردہ: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

جدید تعلیم یافتہ حضرات وخواتین کے لیے دینی علوم کے حصول کا نادر موقع

رجوع الی القرآن کورس

(دورانیہ ۹ ماہ)

عرصہ 42 سال سے باقاعدگی سے جاری تعلیم

مضامینِ تدریس

پارٹ ۱ (سالِ اوّل) برائے مردوخواتین

- تجوید و ناظرہ
- عربی گرائمر (صرف ونحو)
- ترجمہ قرآن (مع تفسیری ولغوی توضیحات)
- دورہ ترجمہ قرآن
- قرآن حکیم کی فکری وعملی رہنمائی
- سیرت وشمائل النبی ﷺ
- مطالعہِ حدیث واصطلاحاتِ حدیث
- فکرِ اقبال
- فقہ العبادات
- معاشیاتِ اسلام
- اضافی محاضرات

پارٹ ۲ (سال دوم) برائے مردحضرات

- عربی زبان وادب
- اصولِ تفسیر
- تفسیر القرآن
- اصولِ حدیث
- درسِ حدیث
- اصول الفقہ
- فقہ المعاملات
- عقیدہ (طحاویہ)
- اضافی محاضرات

☆ رجسٹریشن یکم رمضان سے شروع ہے۔ ☆ انٹرویو 02 ستمبر
آغاز کلاسز 03 ستمبر 2024ء (ان شاءاللہ)

ایام تدریس: پیر تا جمعہ

اوقات تدریس: صبح 8:15 بجے تا 12:50

نوٹ:
بیرونِ لاہور رہائشی صرف مرد حضرات کے لئے ہاسٹل کی محدود سہولت موجود ہے۔ ہاسٹل میں پہلے آیئے پہلے پایئے کے اصول پر رہائش دی جاتی ہے لہذہ خواہشمند حضرات پہلے سے رجسٹریشن کروالیں۔

ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی خدماتِ قرآنی کا مرکز —— قرآن اکیڈمی
K-36 ماڈل ٹاؤن لاہور
email:irts@tanzeem.org
www.tanzeem.org

زیرِ انتظام: مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور (رجسٹرڈ)
مزید تفصیلات کے لئے www.tanzeem.org
03161466611 - 04235869501-3